فرانسیسی ادب نمبر
ہمایوں
ایڈیٹر
بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں بی۔ اے
SHARIF
LAHORE

"فرانسیسی ادب نمبر"

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء

جلد (۲۸) نمبر (۳)

تصاویر:- (۱) والٹیر (۲) روسو (۳) ڈوما (۴) شیتو بریاں (۵) وکٹر ہیوگو (۶) سٹینڈھل (۷) بالزک (۸) موپساں (۹) مولیئر

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول — قیمت فرانسیسی ادب نمبر ار

بزمِ ہمایوں

"فرانسیسی ادب نمبر" اُس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جو اہلِ اُردو کو غیر زبانوں کے ادب سے روشناس کرنے کے لئے "روسی ادب نمبر" سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ ایک ماہوار رسالے کی قلیل ضخامت ایک زبان کی ادبیات کے ہر دور اور ہر مصنف کے کارناموں کا سرسری سا احاطہ بھی نہیں کر سکتی اس لئے "روسی ادب نمبر" کی طرح موجودہ نمبر کو بھی کسی طرح جامع و مانع نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ پرچے میں صرف چند اہم فرانسیسی ادبا و شعراء کی تحریر کے نمونے پیش کئے جا سکے ہیں لیکن بعض اور اہم اور خصوصاً ہم عصر ادبا و شعراء کے مضامین کا نمونہ پیش کرنے سے یہ پرچہ قاصر رہا ہے اور اس کے سوا موجودہ قلتِ حجم کے ہاتھوں چارہ بھی نہیں۔

بہرحال یہ سلسلہ دلچسپ ضرور ہے اور اہل الرائے حضرات نے اسے مفید سمجھا ہے۔

جن اصحاب نے ہماری درخواست پر موجودہ پرچے کے لئے مضامین اور افسانے لکھے ہم اُن کے بالعموم اور مسٹر سعادت حسن کے بالخصوص ممنون ہیں جنھوں نے اس پرچے کی ترتیب میں بہت دلچسپی لی اور اس کے لئے مضامین لکھنے اور فراہم کرنے میں ہمیں قابلِ قدر مدد دی۔

کسی دوسری جگہ حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک اعلان شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی ہے کہ صاحبِ موصوف نے دہلی سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جوش اقبال کے بعد عہدِ حاضر کا سب سے بڑا ہندوستانی شاعر ہے۔ اس کی ہمہ گیر اور ہمہ رس نگاہ کوہ و کاہ اور ذرہ و خورشید کا یکساں احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اگر فلسفے اور عمل آموزی میں ہم اسے ایک طرف غالب و اقبال کے قریب دیکھتے ہیں تو دوسری طرف جزئیات کے مشاہدے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی اہمیت کے احساس سے بہرہ ور ہوتے ہیں ہم اسے نظیر اکبر آبادی کے سلسلۂ خیال کی ایک ارتقائی کڑی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اتنے بڑے شاعر اور ادیب کا صحافت کی طرف متوجہ ہونا ملک کی خوش قسمتی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اہلِ ملک حضرتِ جوش کی آواز کا کماحقہ خیر مقدم کریں گے۔

تصاویر

موجودہ نمبر جن فرانسیسی مشاہیر کی تصویروں سے مزین ہے ان میں سے اکثر کا تذکرہ اس پرچے کے مضامین میں موجود ہے

وکٹر ہیوگو

سٹینڈہل

والٹیر

روسو

ڈیوما

شاتوبریڈاں

مولیر

لیکن یہاں یکجا تصاویر کا سرسری سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے:-

والٹیر (۱۶۹۴-۱۷۷۸ء) فرانکوئے ماری آروئے جو اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی فضلا میں ممتاز ترین شخصیت کا مالک تھا اِس نام سے مشہور ہے۔ اس کی ذہنی استعداد اپنے تنوع اور وسعت کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے۔ اس کے ڈراموں کی تعداد ہی پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہے جن میں سے بعض دنیا کے بہترین ڈراموں میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ اس کی شاعری قدرتِ بیان، قدرتِ فن اور بذلہ سنجی کے قابلِ قدر نمونے پیش کرتی ہے اور ناول نویسی میں تنزیہ نگاری کے اس استاد کے شاید دو ہی چار اور حریف ہوں۔ **روسو**۔ جین جیکیس روسو ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوا۔ ۱۷۴۱ء میں وہ پیرس میں رہنے لگا۔ اس نے اپنی تحریروں میں مذہب اور ریاست کے نظام سے بغاوت کی جس کے باعث ۱۷۶۲ء میں اسے سوئٹزرلینڈ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ ۱۷۷۰ء میں وہ دوبارہ پیرس آیا اور ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو مر گیا۔ **الگزنڈر ڈوما** (۱۸۰۲-۱۸۷۰ء) ۲۷ سال ہی کی عمر میں یہ ایک کامیاب ناول نویس کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ ۱۸۴۴ء میں "تھری مسکیٹیرز" کی اشاعت کے بعد اس کی قابلیت کے جوہر پوری طرح کھل گئے۔ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۰ء تک اس نے حیرت انگیز تعداد میں ناول لکھے اور اس کی تصنیفات کی طلب اتنی بڑھی کہ آخر اسے مددگاروں کی ایک جماعت رکھنی پڑی جن کی تحریروں کی اصلاح و ترمیم کر کے وہ طلب و رسد کا توازن قائم رکھتا۔ **شیتوبریاں** (۱۷۶۸-۱۸۴۸ء) یہ سینٹ مالو میں پیدا ہوا۔ فرانسیسی افواج میں کچھ مدت تک کام کرنے کے بعد یہ پیرس آ گیا اور یہاں شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ۱۷۹۱ء میں یہ امریکا چلا گیا اور لوئی ہشتم کے قتل تک وہیں رہا۔ اس موقع پر یہ فرانس واپس آیا اور ۱۷۹۲ء میں جمہوریت پسندوں کے خلاف لڑتا ہوا شدید طور پر زخمی ہوا۔ آخر اس نے انگلستان میں پناہ لی۔ نپولین کے تخت نشین ہونے پر وہ پیرس واپس آیا جہاں اس نے اپنی حیرت انگیز تصانیف کی اشاعت شروع کی۔ **وکٹر ہیوگو**۔ یہ ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا۔ وکٹر ہیوگو فرانس کے اہم ترین شعرا میں سے ہے۔ یہ شاعری میں رومانی تحریک کا محرک ہوا۔ ناول نویسی کی طرف بھی اس نے توجہ کی اور اس فن میں بھی اس نے درجۂ امامت حاصل کیا۔ یہ اپنے عہد کے نظامِ معاشرت سے بیزار تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں غریبوں پر طبقۂ امرا کے مظالم بہت دردناک طریقے سے بیان کئے ہیں۔ "لامزرابلز" اس کا مشہور ترین ناول ہے جسے بعض نقادِ دنیا کا بہترین ناول سمجھتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ **سٹینڈھل** (۱۷۸۳-۱۸۴۲ء) ماری ہنری بیلی اس نام سے مشہور ہے۔ یہ فرانسیسی ناول نویسوں میں پہلا شخص ہے جس نے رومانی تخیلات کا خاتمہ کر کے ناول کو حقیقت پسندی کی راہ پر ڈالا اور اپنے عہد کی حقیقی زندگی کے غیر جذباتی غیر مبالغہ آمیز مرقعے پیش کئے۔ **بالزک** (۱۷۹۹-۱۸۵۰ء) یہ فرانس کا مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار ہے۔ اس کے ناول کثیر التعداد ہیں جن میں سے بعض تاریخی ہیں اور اکثر اپنے عہد کی زندگی کے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ وہ اپنے فسانوں میں حسنِ تفصیل و صفائی کے ساتھ اپنے عہد کی معاشرت کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس میں بہت کم مصنفین اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انسانی جذبات کا تجزیہ کرنے میں بالزک کا ملکہ بے مثال ہے۔ **موپساں** (۱۸۵۰-۱۸۹۳ء) مشہور فرانسیسی فسانہ نگار ہے جس کے افسانے تجزیۂ نفس کے حیرت انگیز نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہ انسانی نفسیات کا غیر جانبدار مصور تھا اور فن کاری کو نیکی یا بدی کی تبلیغ کا ذریعہ نہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کے اکثر افسانے افراد پر معاشرہ اور قوانینِ قدرت کے ظلم کا مرقع دکھاتے ہیں۔ **مولیئر** (۱۶۲۲-۱۶۷۳ء) یہ کامیاب فرانسیسی ڈراما نگار مزاحیہ نگاری کا استاد ہے۔ اس کے ڈراموں میں جذباتی تجزیے اور انسانی کمزوریوں کے دلاویز مرقعے عدیم النظیر ہیں۔ اس کے متعدد ڈرامے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں جن میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کے تراجم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولیئر ڈراما نویس ہی نہیں ایک کامیاب ایکٹر بھی تھا۔

فرانسیسی ادب پر ایک سرسری نظر

"کسی زمانہ میں ایک ڈاکو رہتا تھا جو ڈاکا ڈالنے سے پہلے دُعائیں مانگ لیا کرتا۔ ایک دن وہ گرفتار ہوگیا اور اس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی لیکن خدا کو اسے دار پر مارنا منظور نہ تھا اس لئے ایک وُلی نے جو اس کی التجائیں سُن چکا تھا، آسمان سے اُتر کر اس کی جان بچالی"۔

فرانسیسی ادب کی ابجد اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے منظوم قصے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گیت جو مبالغے اور توہمات سے پُر ہوتے اور ایک حد تک مؤثر بھی تھے فرانسیسی ادب کے پہلے کارنامے ہیں۔ ایک بازیگر کا بہت مشہور قصہ ہے کہ "وہ اپنا پُرانا پیشہ چھوڑ کر خانقاہ میں داخل ہوگیا لیکن اسے مذہبی رسوم سے واقفیت نہ تھی اس لئے اس نے اپنے خیال کے مطابق حضرت مریم کے سنگیں مجسمہ کے سامنے اپنے کمالات دکھانے شروع کئے۔ اس دلی عقیدت کا اجر اسے اسی طرح ملا کہ حضرت مریم کا مجسمہ حرکت میں آیا اور آپ نے اپنی نشست سے اُتر کر اپنے آنچل سے اس کی پیشانی کے قطرے پونچھے" وغیرہ وغیرہ۔ ان قصوں سے فرانسیسیوں کی سادہ دلی کی شہادت ملتی ہے۔ فرانس ایک بت پرست ملک تھا اور اس نے آہستہ آہستہ مذہب کی طرف میلان دکھانا شروع کیا تھا۔ اس کے غریب باشندے جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر زندگی گذارا کرتے۔ مذہب ان کے لئے ایک بہت بڑا ہمدرد ثابت ہؤا۔ ان کی جہالت اور سادہ لوحی انہیں جو کہا جاتا اس پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور کرتی۔ ان کے لئے زندگی کا بس یہی واحد مصرف تھا کہ اسے اس طرح گذارا جائے کہ آخرت میں اس محنت اور خوف کا کافی صلہ ملے۔

مائیں بچوں کو قصے سنایا کرتیں کہ کوئی راہبہ خلوت کی زندگی سے عاجز آکر بھاگ نکلی۔ ایک مُدت تک بُری زندگی گذارتی رہی آخر اسے اپنے گناہ کا خیال آیا اور وہ اس کے تلافی کے لئے پھر خانقاہ میں داخل ہوگئی۔ لیکن وہاں اس دوران میں حضرت مریم اس کے بھیس میں اس کے فرائض انجام دیتی رہی تھیں اور وہ پھر وہاں اس طرح داخل ہوئی کہ اس کی گذشتہ زندگی کا حال کوئی جان بھی نہ سکا۔

بالوں کو اس قصہ میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی کہ ایک بہادر سپاہی کو کسی گناہ کی سزا کے سلسلہ میں ایک راہب کی ٹوکری میں پانی بھر لانے کا حکم ہؤا۔ وہ سال بھر تک پانی بھرتا رہا۔ آخر ایک دن اس کی آنکھوں سے ندامت کے سچے آنسو گر لے اور ٹوکری یکایک پانی سے لبریز ہوگئی۔ اس قسم کی نظمیں اور گیت فرانسیسی ادب کی طفولیت کے وقت بہت عام تھے۔ اس کے بعد

ایک دوسرا دور شروع ہؤا۔ اور شاعری نے بہادروں کی مدح اور تعریف کی طرف مُنہ موڑا۔ مسلمان اسپین سے بڑھتے ہوئے فرانس کی طرف چلے آرہے تھے۔ فرانسیسی آنے والے حملے کے ڈر سے قبل از وقت مرے جارہے تھے۔ شارلمین مدافعت کے لئے اُٹھتا ہے اور سارا ملک اس کی تعریف سے گونج اُٹھتا ہے۔ بچے اس کی تعریف میں سڑکوں اور کھیتوں میں گاتے پھرتے تھے۔ یہ نظمیں بہت دلچسپ ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور رولینڈ کی ایک نظم ہے۔

گیارھویں صدی:۔ ان ساری نظموں میں خرق عادت واقعات کی بھرمار ہے۔ معجزے، معجزے نہیں باقی رہے کیونکہ وہ ہر ہر قدم پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سیدھے سادھے فرانسیسی اپنے گذشتہ بہادروں کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ سب کچھ صحیح ماننے پر مجبور معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں نے اُن میں ایک تازہ روح پھُونک دی۔ سپاہی یہ سمجھنے لگا کہ فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑتے ہیں اور خدائی فوج اُن کی مدد کے لئے تیار رہتی ہے۔

رفتہ رفتہ لوگ پُرانے قصّوں اور گیتوں سے تنگ آنے لگے۔ ان کی جگہ یونانی اور رومی بہادروں کے قصّوں نے لے لی یہاں بھی عجائبات کی وہی فراوانی تھی۔ خواہ وہ سیزر کی داستان ہو یا سکندر کی خواہ ہکٹر کا قصّہ ہو یا اینیز کا۔ مغنی یہی کہتا ہے کہ وہ ایک ایسی بستی کے مکین تھے جہاں کوئی واقعہ بغیر جادو یا معجزہ کے رُونما ہوتا ہی نہیں۔ بہادری دکھانے کو ہیرو کو سمندر سے گزار دیتے ہیں، آگ پر دَوڑا دیتے ہیں، لیکن وہ کچھ ایسی دھات کا بنا ہوتا ہے کہ نہ گُھلتا ہے نہ پگھلتا ہے۔ فرانسیسی ادب اب تک جن اور پری کے قصّوں تک محدود تھا۔

ملک اب صلح اور امن کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ سالہا سال کی خوں ریزی اور جنگ سے لوگ عاجز آگئے تھے اس وقت چرچ کے پاس سب سے بڑی طاقت تھی۔ اس نے ادب کو ترقی دی اور ملک میں امن پھیلانے کی کوشش کی۔ قصیدہ گوئی سے لوگ اب غزل کی طرف مائل ہوئے۔ خیالات میں حسن و محبت کی جھلک پیدا ہونے لگی۔ غزلیں لکھی جاتیں کہ رقص و سرود کے لئے موزوں ہو سکیں۔ عید کے دن کسی خاص جگہ لوگ جمع ہوتے۔ سارا دن عیش و نشاط میں گزرتا۔ خوب ناچتے گاتے۔

بارھویں صدی:۔ اب "مزاح" نے فرانسیسی ادب میں دخل دینا شروع کیا۔ بارھویں صدی میں رینارڈ کے قصّوں سے سارا ملک لطف اُٹھا رہا تھا۔ ایسوپ کے قصّے بہت عام پسند ہو گئے۔ دُنیا بھر کے جانور، پرندے اور مچھلیاں ادب میں گھسیٹ لائی گئیں۔ مذاق ہی مذاق میں اصلاحی پہلو بھی دکھا دیا جاتا۔ ابتداً مذہب نے اس ذوق کو ایک حدِ معینہ کے اندر ہی قائم رکھنا چاہا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مذہبی لوگ بھی عوام کے قہقہوں اور تبسم میں لطف لینے لگے۔

ان چیزوں کو عام کرنے والا بازاری گانے والوں کا وہ طبقہ تھا جو اپنی الگ الگ جماعت قائم کر کے ملک میں پھرا کرتا اور امرا کے دربار میں کمال دکھا کر اپنی روزی کماتا۔ لیکن یہ جماعت بہت جلد نفرت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی اور اس کام کے لئے

تعلیم یافتہ طبقے نے درباروں میں رسائی حاصل کرنی شروع کی۔ فرانسیسی ادب کی ترقی کا یہ پہلا زینہ تھا۔

تیرھویں صدی:- تیرھویں صدی کا شاہکار "داستان گل" نامی نظم کی شکل میں پیش ہوا۔ جس میں محبت کو ایک مقدس اور حسین چیز کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں بندش، زبان اور خیالات کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی عہد میں "تاریخ سینٹ لوئی" لکھی گئی جس میں ایک فرانسیسی بادشاہ کا جو چھ برس تک "مذہبی جنگ" میں لڑا گیا تھا تذکرہ ہے۔ اس میں صحیح واقعات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مصنف بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔

چودھویں صدی:- اس کے بعد فرانسیسی ادب کا تاریخی کارنامہ (Froissart) کی "تاریخ" کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ دربار کے واقعات، سوسائٹی کی حالت بہت سطحی طریقہ پر ظاہر کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ چودھویں صدی کے تاریخی واقعات کے لئے ایک مفید کتاب ہے۔

پندرھویں صدی:- اس صدی میں ایک بڑی شخصیت نے صفحۂ ہستی پر قدم رکھا Philippe de Comines کو "دورِ متوسط کا آخری اور موجودہ دور کا پہلا مؤرخ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ایک عجیب زندگی سے واسطہ پڑا۔ بچپن میں یتیم ہوا۔ نہایت ہی مختصر تعلیم پائی۔ قسمت نے بہادر چارلس کے دربار تک رسائی کرادی۔ لیکن اسے چھوڑ کر لوئی یازدہم سے آملا۔ یہ اس کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ چارلس نہایت ہی جھگڑالو قسم کا آدمی تھا اور اس کے برعکس لوئی ایک عقلمند اور ہوشیار ریاست دان تھا۔ لوئی کی موت کے بعد ہی اسے اس غداری کا صلہ مل گیا۔ چارلس کے طرفداروں نے اسے آٹھ مہینہ تک لوہے کے پنجرے میں مقید رکھا اور اس کے بعد دو برس تک اسے قیدخانہ کی روٹیاں توڑنی پڑیں لیکن یہ بھی اس کے لئے مفید ہی ثابت ہوا۔ اس نے قیدخانہ میں اپنی مشہور عالم "یادداشت" لکھی جو آج بھی مؤرخوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتی ہے۔ یہ ماضی کے رومان اور توہمات سے بالکل جدا سچے واقعات پر مبنی تصنیف ہے۔ انسانی زندگی کے صحیح مناظر اور تاریخ کے سچے واقعات بلاکم وکاست لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی دور میں ایک دوسرا شخص بھی ادبی مشغولیتوں میں غرق تھا۔ دنیا اسے Froncois Villon کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس نے نہایت ہی قابلِ اعتراض زندگی گزاری ہے لیکن اس نے فرانسیسی ادب کو ایک ایسا عمدہ ذخیرہ دیا ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس کی زبان جدت سے معمور نظر آتی ہے۔ اور اس کے گیت صحیح واقعات بیان کرتے ہیں۔ اس کے خیالات انسانی جذبات کے صحیح ترین ترجمان ہیں۔ ویلوں کے ادبی ذخیرہ میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی لیکن صداقت جو اس کے کلام کی جان ہے اسے تاابد زندہ رکھے گی۔

پندرھویں صدی کے آخر میں ایک ان سے بھی بڑی ہستی ظہور پذیر ہوئی۔ F. Rabelais کے والدین غریب تھے۔ اس نے ایک دیہاتی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پندرہ برس تک راہبانہ زندگی بسر کی۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص

جو اتنی مدت تک قعر گمنامی میں رہا ہو یک بیک میدانِ عمل میں آتا ہے اور ایک ابدی شہرت چھوڑ جاتا ہے۔ اس نے اپنی راہبانہ زندگی ہی میں اپنے ادبی ذوق کو ترقی دینی شروع کی۔ اسے ہر قسم کے علم سے ذوق تھا۔ لیکن اس کی خاص دلچسپی کی چیزیں طب، ریاضی اور جوتش تھیں لیکن چرچ اس کے اس ذوق میں حارج ہو رہا تھا مجبوراً اسے مذہب کو خیرباد کہنی پڑی۔

Rabelais نہایت ہی نیک اور بے ضرر انسان تھا۔ اسے پہلے مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ لیکن آخر میں آ کر وہ چرچ کا بہت بڑا دشمن ہو گیا۔ اس کے قصے اب بہت زیادہ دلچسپی سے نہیں پڑھے جاتے۔ اس کا مذاق نہایت ہی بازاری ہے لیکن یہ الزام اس کے سر عاید نہیں ہوتا کیونکہ وہ مجبور تھا۔ اسے اس وقت ویسی ہی فضا ملی تھی۔ وہ کہتا ہے زندگی ہنس کر گزارو۔

سولھویں صدی:۔ سولھویں صدی آتی ہے اور John Calvin صفحہ ہستی پر نمودار ہوتا ہے۔ ریبلائے اور کالون کی تعلیمات میں بہت فرق ہے۔ اول الذکر کہتا ہے کہ خدا رحیم و کریم ہے لیکن مؤخر الذکر کہتا ہے کہ خدا جبّار اور قہار ہے۔ وہ اپنے کسی غلام کو دائمی سرفرازی کی نعمت عطا فرماتا ہے اور بعض ابدی لعنت کا طوق گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں۔ ریبلائے کا فلسفہ گہری نظر سے عاری ہے۔ اس کے برعکس کالون آج تک ایک نئے خیال کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

ان مذہبی مباحثوں کے درمیان Ronsard کی عاشقانہ غزلیں دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر اپنے محبت کے نغموں سے عوام کا دل ایک دوسرے موضوع کی طرف کھینچتا ہے۔ وہ اپنا ایک اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس دور کے اکثر شعراء اسی رنگ میں لکھنے لگے۔ اس کے مضمون میں عمدہ تشبیہوں اور پُرلطف استعاروں کی بھرمار ہے۔

فرانسیسی سقراط:۔

اسی ادبی کشمکش میں ملک کے ایک غریب خطہ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک شخص پیدا ہوا۔ ۱۵۳۳ء کی ایک طوفانی رات تھی کہ Montaigne عالم وجود میں آیا۔ باپ، لابوتی نامی دوست اور مطالعہ ——— تین چیزوں کی مجنونانہ محبت خدا نے اسے ودیعت کی تھی۔ اس نے نہایت خاموش اور پُرلطف زندگی گزاری اور اپنا سارا مطالعہ انسانی فطرت کو سمجھنے میں صرف کر دیا۔ "ہم لوگ حقیقتاً کیا جانتے ہیں؟" اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس کے مضامین بس اس ایک سوال کے جواب سے پُر نظر آتے ہیں۔ وہ ہر جگہ یہی جواب دیتا ہے ——— "بہت ہی مختصر"۔ ملک اسے فرانسیسی سقراط کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کی نظمیں اور مضامین خاموش زندگی کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ شہرت سے گھبراتا ہے۔ زندگی میں وہ صرف مصائب کو دیکھتا ہے لیکن کہیں کہیں خوشی کی چاشنی بھی دکھائی دیتی ہے۔

سترھویں صدی:۔ اب سترھویں صدی آتی ہے۔ فرانس کا دماغ انسانی زندگی کی ماہیت جاننے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے اور وہ کسی فیصلہ کا بے چینی سے منتظر ہے۔ پوری صدی اسی فیصلہ کے لئے غلطاں و پیچاں نظر آتی ہے۔ یہ صدی فرانسیسی ادب کا زریں عہد ہے۔ اس کشمکش میں Pascal اور Descartes کی شخصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو

Madam de- , Moliere , Racine , Corneille , Didrot , Montesquien
Sevigne -- , Boileau , La Rochefoucauld اور La Bruyere نظر آتے ہیں لیکن فرانسیسی
ادب کا یہ زمانہ آزادی کی جد وجہد میں صرف ہوگیا۔ شاعروں اور ادیبوں کے شاہکار لوگوں کو ان کی غلامانہ ذہنیت سے ہوشیار کرنے کے
لئے وقف تھے۔ ڈیکارٹے ایک فلسفی اور سائنسدان تھا۔ وہ شہید ہونے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا تھا۔ اس نے کبھی چرچ اور مذہب
کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن اس نے آزادیٔ خیال کی کھیتی لگائی جو چرچ کے لئے سخت مہلک ثابت ہوئی پاسکل کو ایک ایسے عام
عقیدہ کی تلاش تھی جس کے نُور سے وہ اپنی رُوح کو منوّر کر سکتا۔ وہ بھی ایک سائنس دان تھا۔ چرچ کا مخالف تھا لیکن خدا کے وجود
کا زبردست حامی تھا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "خیالات" ہے۔ انداز بیان اس قدر نفیس اور خیالات اس قدر پاکیزہ ہیں کہ
آج بھی وہ دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ فرانسیسی ادب میں کم آدمی اس کی طرح دلچسپ ہونگے۔ ۱۶۶۳ء میں پیدا ہُوا۔ باپ کا
بہت ہی پیارا تھا۔ غریب باپ نے لائق فرزند کی تعلیم میں سب کچھ لُٹا دیا۔ وہ بارہ برس کے سن میں ایک زبردست ریاضی دان تھا اور سولہ
برس کے سن میں مذہب کے جزئیات سے واقف۔ پہلے ایک مدت تک ملحدوں کی فوج کا سردار بنا رہا اور خدا کے وجود کا منکر رہا۔
چالیس برس کے سن میں انتقال کیا۔ موت کے بعد ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ "اس کا دماغ غیر معمولی طور پر بڑا تھا" وہ دنیا میں کوئی
خوبی نہیں پاتا۔ کہتا ہے کہ دُنیا مصائب اور ناپاکیوں سے پُر ہے۔ وہ صرف "اسباب اور یقین" کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ کہتا ہے کہ
"اعتقاد اور اُمید" کے بغیر ہماری رُوح کو سکون نہیں مل سکتا۔

مولیئر کا درجہ فرانسیسی ادب میں ناقابلِ بیان ہے۔ صرف فرانس ہی نہیں بلکہ دُنیا اس کی تصانیف کی مرہونِ منت نظر آتی ہے۔
سر والٹر اسکاٹ اسے "مزاحیہ نویسوں کا شہزادہ" کہا کرتا تھا۔ ۱۶۲۲ء میں ایک معمار کے گھر میں پیدا ہوا۔ باپ کو شاہی دربار سے
تعلق تھا لیکن بیٹے نے بجائے بادشاہ کے پاس جانے کے تھیئٹر میں نوکری کر لی اور پارٹ کرنے لگا۔ ایکٹر کی حیثیت سے اسے شہر
بشہر سفر کرنا پڑتا۔ یہ بات اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اسی نے اسے انسانی فطرت کا ماہر بنا دیا۔ اکاون برس کے سن میں
اس کا انتقال ہوا۔

سترھویں صدی کے آخر میں ان قہقہوں اور تبسم کے درمیان، دو شخص پیدا ہوئے۔ انسائیکلوپیڈیا کا مصنف Pierre
Bayle اور مشہور مبلغ Bossuet جس کا اعتقاد تھا کہ چرچ انسانی روح کا ابدی مالک اور شاہِ فرانس، ملک کے سیاہ سفید کا تنہا ذمہ دار
ہے۔ وہ پروٹسٹنٹ خیالات کا سخت مخالف تھا۔ اس کے خیال میں اگر ملک پر بادشاہ اور انسانی روح پر چرچ اچھی طرح قابض ہوں تو ملک میں
کسی قسم کی بدعنوانی نہیں پھیل سکتی۔ اس کی اُن ہنگامہ خیز تقریروں اور تحریروں کے درمیان ایک شخص ایک گوشہ میں بیٹھا ایک ایسا کام کر رہا تھا
جس کا احسان فرانس کبھی بھول نہیں سکتا۔ یہ بیل کی ذات تھی جو اپنا "تاریخ کا لُغت" مرتب کر رہا تھا۔

اٹھارھویں صدی :- یہ فرانسیسی تاریخ کا سب سے ہنگامہ خیز زمانہ ہے۔ والٹیئر نے رومن چرچ پر لعنت بھیجی اور عوام کو تعلیم دی کہ کہ اسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکو۔ وہ مذہب اور روح کا قائل ضرور تھا لیکن چرچ کو ایسی طاقت سمجھتا تھا جو تاریکی کو پسند کرتی ہے اور نورت نفرت کرتی ہے۔ اسے اپنے ظلم کی چکی میں بُرے بھلے کی تمیز کرنی بھی نہیں آتی۔

روسو نے تعلیم دی کہ ماضی بہترین دور تھا، تہذیب نام ہے غلامی کا اور سادہ انسان ہی آزاد اور مطمئن زندگی گذار سکتا ہے۔ ان دو دماغوں سے انقلاب فرانس کی روح کو غذا مل رہی تھی۔ والٹیئر مذاق میں بے مثل ہے۔ یہ ایک بجلی کی طرح ہے جو تاریکی کے پردہ کو چاک کر دیتی ہے پرانی چیزوں کو مسمار کر دیتی ہے لیکن مسافر اس سے راستہ نہیں پا سکتا اور اس کی روشنی میں پڑھ نہیں سکتا۔

روسو سیدھے سادھے الفاظ میں گہرے مطالب چھپاتا ہے۔ سطحی نظر دوڑانے والے اس کے معنی کو جلد نہیں پا سکتے۔ قدرت نے والٹیئر اور روسو کی شکل میں انقلاب فرانس کے دو زبردست نقیب پیدا کئے تھے۔

تمام علوم و فنون اس دور میں دربار شاہی کی ملکیت تھے۔ عوام سے انہیں ذرا بھی تعلق نہ تھا۔ مذہب ایک ایسی طاقت کا نام تھا جو صرف سیاسی ضروریات میں کام آتے۔ عوام کی تکالیف اور ذلتوں کی حد ہو چکی تھی۔ اس حالت میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور دفعتہً سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس چکی میں بدوں کے ساتھ اکثر نیک بھی پس گئے

اس آتش زدگی میں ایک قابل ذکر ہستی نظر پڑتی ہے۔ یہ *Beaumarchais* ہے جو ایک گھڑی ساز کا لڑکا تھا۔ اس نے تھیئٹر کو انقلاب کی ترقی کے لئے آلۂ کار بنایا۔ اس کے ڈرامے عموماً یہ دکھایا کرتے کہ فرانسیسی کیسی بُری اور غلامانہ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنی یادداشت میں لکھتا ہے "میں ایک شہری ہوں یعنی ایک بالکل نئی چیز ——— فرانس کیلئے بالکل ہی ان دیکھی بات۔ میں ایک شہری ہوں ——— یعنی وہ جو تمہیں دو صدی پہلے سے ہونا چاہئے تھا اور جو تم آج سے بیس برس بعد ہو سکو تو ہو سکو" یہ ۱۷۷۴ء میں لکھا گیا تھا اور یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

فرانس میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نئے فلسفہ اور سائنس سے نفرت کرتا اور صرف پُرانے علم و فن ہی کو زندہ رکھنا پسند کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کیلئے روسو کے ایک دوست *Bernardin* نے ایک کتاب *Paul and Virginia* لکھی۔ یہ ایک مکمل قصہ ہے جو رومان سے بہت ہی بھدے طریقہ سے بھر گیا ہے۔ اس وقت اس کے مصنف کی بڑی قدر تھی اور ممکن تھا کہ فرانسیسی ادب اس کی پیروی کر کے ہمیشہ ہی کیلئے نیست و نابود ہو جاتا لیکن سیاسی طوفان کتاب اور اس کے مصنف دونوں کو بہا لے گیا۔

۱۷۹۲ء میں اس سیاسی طوفان کے درمیان ادب صرف ایک بار سر اُٹھا سکا *R. de Lisle* نے اپنی مشہور نظم *La Marseillaise* لکھی جو باغیوں کا ترانۂ جنگ بن گئی لیکن انقلاب نے ادب کو طوفانی فرانس سے مار بھگایا۔ کتب خانے درباروں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ اس عہد کی کوئی چیز بھی اس وقت دکھائی نہیں دیتی بجز *Memoirs* کی تصنیف کے جو اس کی موت کے بعد چھپی اور جس میں اس نے والٹیئر

کے خیالات کی تردید کی ہے۔ اس بلوفانی فضا میں The Genius of Christianity لکھی گئی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ادب بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہ پہلی آواز تھی جس نے فرانس کو اس حماقت سے آگاہ کرنا چاہا کہ اطمینان صرف دولت میں نہیں ہے۔ یہ کوئی بڑا پیام نہ تھا لیکن اس وقت اس کا سب نے ساتھ دیا حتٰی کہ فرانس کے عظیم الشان مصنف وکٹر ہیوگو نے بھی اس کی تائید کی۔

اُنیسویں صدی:- اس صدی کے اوائل کا سب سے بڑا فلسفی Auguste Comte سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں جدید اور پرزور خیالات فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے ـــ انسانی دماغ پرورش پاتا رہا اور اس نے علت و معلول کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ دُنیا کے عجائبات پر دماغ سوزی کی۔ آخر اس فیصلہ پر آیا کہ وہ اس معمے کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ سمجھ کر اس نے اپنی اسی ترقی میں زندگی گزار دینا مناسب سمجھا۔

لیکن یہ ایک ایسی غذا تھی جو انسانی روح کی عرصہ تک پرورش نہیں کر سکتی۔ ایک انقلاب بہت جلد رونما ہوا۔ Victor Hugo اور Lamennais نے رومن چرچ کو اس حد تک رواداری برتنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی کہ ہر شخص اپنے ضمیر کے مطابق خدا کی پرستش کر سکے۔ اس تعلیم سے رومانی شاعروں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جو عیسائیت اور شخصی حکومت کی ہمدرد تھی۔ Gautier اس جماعت کا سردار کہا جا سکتا ہے۔ شاعری کے رباب پر اس نے چمکتے ہوئے الفاظ سے نغمہ سرائی کی۔ اس نے کوئی خاص بات نہیں کہی لیکن اس دور کے نوجوان اسے ادب کا دیوتا سمجھتے تھے۔

ان دھیمے سروں کے درمیان Beranger کے تیز نغمہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی شاعری الفاظ کے شان و شکوہ سے بے نیاز ہے۔ اس نے عوام کی زبان کو اپنے خیالات کا ترجمان بنانا مناسب سمجھا۔ فرانس کو اس کا نغمہ بہت پسند آیا لیکن غریب شاعر بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا۔ اپنی عظمت کے خیال سے گمراہ ہو کر اس کا کلام مضحکہ خیز بن کر رہ گیا۔ اس کی جگہ لینے کیلئے فرانس کا عظیم الشان ادیب وکٹر ہیوگو پیدا ہوا۔ انقلاب کے چشمہ میں غسل صحت کر کے فرانسیسی ادب اپنے پورے نکھار کے ساتھ پھر جلوہ ریز ہوا۔ ترجمہ اس کے اصلی حسن کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس جلا وطن محب قوم شاعر نے ایک ایسا غیر فانی نغمہ چھیڑا جو رہتی دُنیا تک گایا جائے گا۔ ہیوگو نے فرانسیسی ادب کو ایک تازہ روح بخشی ہے۔

اس وقت فرانسیسی ادب کے سیمیں تخت کے گرد ادیبوں کا ایک عظیم الشان دربار لگا تھا۔ صف اوّلیں (۱) George Sand ـــ دیہاتی زندگی کی مایہ ناز مصور (۲) De Balzac ـــ انسانی مزاج کے دو ہزار کردار کا صانع (۳) Prosper Merimee (۴) ہر دو (۵) Dumas (۶) Guy de Maupassant (۷) Flaubert (۸) Daudet (۸) Guizot اور Thierry ـــ مؤرخ (۹) Renan مذہبی لٹریچر کا حامی (۱۰) Saint Beuve ـــ مشہور نقاد ـــ کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں لیکن باقی تمام صفیں بھی ادیبوں سے پٹی پڑی ہیں۔ ہیوگو کے بعد یورپ میں فرانسیسی ادب کی دھاک بندھ گئی۔ اس کی بہترین مثال اناطول فرانس کی شکل میں مل سکتی ہے۔

فرانسیسی ادب پر ابتدا سے انتہا تک نظر دوڑایئے۔ آرنلڈ کا جملہ کتنا زبردست اور صحیح ہے:-

Versed in all arts, in none supreme

فرانسیسی ادب میں سب کچھ ہے لیکن ہم نہ وہاں شکسپیر پاتے ہیں نہ ملٹن۔ نہ دانتے کی صورت نظر آتی ہے نہ گوئٹے کی!!!

شمسی کاکوی

آخری سبق

اُردو داں حضرات بعض تراجم کی وجہ سے وکٹر ہیوگو، اناطول فرانس اور گائی دی ماپساں سے ایک حد تک تو آشنا نہیں ہیں لیکن ان تین فرانسیسی مصنفین کے علاوہ وہ کسی اور فرانسیسی ادیب کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں اور اس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو داں حضرات کو تراجم کے ذریعہ سے فرانسیسی مصنفین کے قابلِ قدر خیالات سے آگاہ کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ مدیر ہمایوں کو اس ضرورت کا احساس ہُوا اور اُنہوں نے روسی ادب کی طرح فرانسیسی ادب کے متعلق بھی ایک خاص نمبر نکالنے کا قصد کرلیا۔ اُمید تو ہے کہ دیگر جرائد نیز متعدد مصنفین مدیر ہمایوں کی تقلید کریں گے اور رفتہ رفتہ اُردو داں حضرات فرانسیسی مصنفین کے افکار بلند سے کماحقہ واقف ہو جائیں گے۔ جہاں تک مختصر افسانوں کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میدان میں فرانسیسی ادیب گوئے سبقت لے گئے ہیں اور مختصر افسانہ نویس کے لئے فرانسیسی ادب کا مطالعہ لابدی ہے۔ پندرھویں صدی میں فرانسیسی مصنفین نے باقاعدہ مختصر افسانہ نویسی کی ابتدا کی اور اُنیسویں اور بیسویں صدی میں بالزاک، ڈوڈے اور گائی دی ماپساں وغیرہ واجب التعظیم فرانسیسی ادیبوں نے اس فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ گائی دی ماپساں کی سحر طرازی کا اندازہ بعض ناظرینِ ہمایوں کو سید امتیاز علی صاحب تاج کی قابلِ قدر کتاب "ہیبت ناک افسانے" سے ہو گیا ہوگا لیکن بالزاک اور ڈوڈے کا نام بہت کم اردو داں حضرات نے سُنا ہوگا۔ بالزاک ناول نویسی کا بادشاہ تھا لیکن اس کے مختصر افسانے عجیب و غریب رومانیت کے باوجود ڈوڈے کے سیدھے سادے افسانوں کے مقابلہ میں نہیں لائے جا سکتے۔ الفانسے ڈوڈے (سنہ ۱۸۴۰ء تا ۱۸۹۷ء) تو پیدا ہی ہُوا تھا مختصر افسانہ نویس بننے کے لئے۔ ڈوڈے کا کوئی افسانہ پڑھیئے آپ کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ اس میں کہیں بھی آورد ہے۔ پڑھیئے گا تو دل میں کہیئے گا کہ اس سے کہیں بہتر افسانہ ہم خود لکھ سکتے ہیں لیکن لکھنے بیٹھیئے گا تو اس کا تتبع مشکل نہیں محال نظر آئے گا اور یہی سہل ممتنع کی تعریف ہے۔ ڈوڈے کی زندگی میں ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس سے اس کا وطن پرست دل تڑپ گیا اور اس نے اس دبی ہوئی چوٹ کو اپنے کئی افسانوں میں بالاعلان بیان کیا۔ یہ ناخوشگوار واقعہ اہل جرمنی کا فرانس کے بعض حصص پر قابض ہو جانا تھا۔ ڈوڈے نے مختلف عنوانوں سے متعدد افسانوں میں اس قبضے کے خلاف احتجاج کیا ہے لیکن ان سب افسانوں میں کامیاب ترین افسانہ وہ ہے جس میں ڈوڈے نے ایک معصوم بچے کی کیفیاتِ قلب کو بیان کیا ہے اور اسی افسانے کا ترجمہ ناظرینِ ہمایوں کی نذر کیا جاتا ہے۔

طالب صفوی

(۱)

اسکول جانے میں بہت دیر ہو گئی تھی اور رہ رہ کے یہ خیال آتا تھا کہ بچا آج خیریت نہیں ہے میسیو ہامیل نے کہہ دیا تھا

کہ قواعد خوب یاد کرکے لانا اور یہاں قواعد کا ایک حرف بھی یاد نہیں تھا اس پر اتنی دیر ہوگئی! بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی - چڑیاں چہچہا رہی تھیں سورج خوب چمک رہا تھا پن چکی کے پیچھے والے میدان میں جرمن سپاہی پریڈ کر رہے تھے یہ سب چیزیں قواعد ایسے خشک مضمون سے کہیں زیادہ دل فریب تھیں بلکہ سچ کیوں نہ کہوں میرا ارادہ بھی ہوا تھا کہ اول پٹنا آخر پٹنا دیر تو ہو ہی گئی ہے ان سب چیزوں سے اچھی طرح لطف اُٹھانے کے بعد ہی کیوں نہ اسکول جاؤں؛ لیکن پھر خیریت اسی میں نظر آئی کہ سیدھا اسکول ہی کا رُخ کروں اور میں نے میسیو ہامیل کے عتاب سے بچنے کی دُعا مانگ کر طرارے بھرنا شروع کر دیئے - ٹاؤن ہال پر دم لینے کے لئے ذرا کی ذرا رُکا تو اس کے اندر جمِ غفیر نظر آیا دل نے کہا چلو یہ تماشا بھی دیکھتے چلو پھر خیال آیا کہ اس نحوس ٹاؤن ہال میں رکھا ہی کیا ہے؛ ہم نے تو دو برس سے یہی دیکھا کہ سب بُری بُری خبریں اسی ٹاؤن ہال سے شائع ہوئیں - کبھی یہ پرچہ لگا کہ فرانسیسی ہار گئے کبھی یہ خبر ملی کہ جرمن ہمارے قصبے میں داخل ہونے کو ہیں پھر ایسی خبروں سننے سے فائدہ ہی کیا؛ اسکول جانے کے لئے دوڑنا شروع کیا تو واشٹر نے زور سے آواز دی کہ بھاگتے کیوں ہو ابھی تو بہت وقت باقی ہے میں سمجھا کہ مذاق کر رہا ہے اور میں نے اور بھی تیز بھاگنا شروع کر دیا - اسکول کے باغ میں پہنچا تو عالم ہی بدلا ہوا پایا - معمولاً ہمارے اسکول کے شور وغل کی آواز گلی سے سنائی دیتی تھی اور ڈیسکوں کے کھلنے اور بند ہونے لڑکوں کے پڑھنے اور میسیو ہامیل کی آہنی چھڑی کے کھٹاکوں سے ایک حشر بپا رہتا تھا مگر آج تو کچھ اس غضب کا سناٹا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اسکول کئی دن کی چھٹی کے لئے بند ہوگیا ہے - دبے پیر کھڑکی کے پاس جا کر دیکھا تو سب لڑکوں کو موجود پایا بس جان سن سے نکل گئی اور یقین ہوگیا کہ آج خیریت نہیں ہے خیر ڈرتا لرزتا ہانپتا کانپتا اسکول میں داخل ہوا - خیال کیا یقین کامل تھا کہ میسیو ہامیل برس پڑیں گے مگر اُنھوں نے نہایت شفقت سے کہا "جاؤ فرانز اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ ہمیں تمہارا انتظار تھا" بینچ کو پھاند کر اپنی جگہ بیٹھا تو جان میں جان آئی اور اطمینان سے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا - میسیو ہامیل پر نگاہ پڑی تو ان کو اسی شاندار لباس میں ملبوس پایا جو وہ افسرانِ بالا کے معاینے کے دن پہنتے تھے - لڑکوں کو دیکھا تو نہ وہ شوخی تھی نہ وہ مسکراہٹ - سب کے سب خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے - لیکن مجھے سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے قصبے کے معززین کو اسکول کے ہال کے آخری حصہ میں گردن جھکائے بیٹھے دیکھا - ہمارے قصبے کے سابق میئر بھی بیٹھے تھے معزول شدہ فرانسیسی پوسٹ ماسٹر بھی موجود تھے اور ضعیف العمر ہونے پر بھی کوئی کتاب کھولے ہوئے دیکھ رہے تھے -

(۲)

میں اس غیر معمولی خاموشی کا سبب اپنے پاس والے لڑکے سے پوچھنے ہی کو تھا کہ میسیو ہامیل نے کرسی کے پاس جا کر نہایت حزیں مگر صاف آواز میں کہنا شروع کیا "بچو! میں آج تمہیں آخری مرتبہ سبق پڑھانے آیا ہوں - برلن سے حکم آگیا ہے کہ

السّاس اور لورین کے تمام سکولوں میں صرف جرمن زبان پڑھائی جائے کل سے نیا ماسٹر نئی زبان میں تعلیم دے گا۔ بچو! یہ فرانسیسی کا آخری سبق ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے توجہ سے سنو" معلوم ہُوا کہ جیسے کسی نے دِل پر گھونسہ مار دیا۔ میں زیرِ لب بڑبڑانے لگا "بدمعاش! یہی ان کم بختوں نے ٹاؤن ہال میں حکم دیا ہوگا جبھی تو وہاں اتنا مجمع تھا" میسیو ہامیل باری باری سے لڑکوں کا آموختہ سن رہے تھے اور میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ قواعد مجھے کبھی یاد نہیں ہوئی لیکن اس کے قبل یاد نہ ہونے کا افسوس نہیں ہوتا تھا ہاں پٹنے کا خوف ہوتا تھا مگر آج خوف کی جگہ دِل پر افسوس اور شرمندگی کا قبضہ تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ اگر سچ مچ فرانسیسی کا یہ آخری سبق ہے تو غضب ہے کیونکہ مجھ کم بخت کو تو ابھی اچھی طرح فرانسیسی لکھنا بھی نہیں آیا ہے۔ کبھی افسوس ہوتا تھا کہ میں نے اپنا وقت پڑھنے کے بجائے چڑیوں کے گھونسلے برباد کرنے میں کیوں ضائع کیا؛ وہی کتابیں جن کا اسکول تک لانا بوجھ معلوم ہوتا تھا اب اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز معلوم ہو رہی تھیں اور کتابوں کا کیا ذکر میسیو ہامیل کی سخت گیری کے باوجود ان کی جُدائی بھی شاق تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ میسیو ہامیل نے اتنا شاندار لباس کیوں پہنا اور سب قصبے والے اُداس کیوں بیٹھے ہوئے ہیں شاید ان کو بھی اچھی طرح فرانسیسی نہ پڑھنے کا صدمہ ہے! میں انہیں خیالات میں منہمک تھا کہ میسیو ہامیل نے میرا نام لے کر پکارا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی میرے سب کھلونے لے لے مگر مجھ میں یہ قوت پیدا کر دے کہ میں اس وقت اپنا آموختہ فر فر سنا دوں مگر بھلا کہیں آرزو سے تقدیر بدل سکتی ہے؟ کھڑا ہُوا تو ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکا۔ میسیو ہامیل نے میری نیچی نگاہوں سے میرے دل کا اندازہ لگا کر کہا "فرانز تم خود شرمندہ ہو اس لئے میں تم کو کوئی سزا نہیں دوں گا۔ دیکھا بیٹا اسی دن کو سمجھاتے تھے کہ اپنی زبان سیکھنے میں غفلت نہ کرو! اب تم لوگ کہو گے بھی کہ ہم فرانسیسی ہیں تو فرانسیسیوں کو یقین نہ آئے گا وہ اپنے دِل میں کہیں گے کہ یہ کیسے فرانسیسی ہیں جو نہ فرانسیسی پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ بیٹا یہ نہ سمجھنا کہ میں صرف تم بچوں پر الزام عائد کرتا ہوں۔ قصور ہم سب کا ہے۔ تم لوگوں نے پڑھنے سے جی چرایا تمہارے والدین نے تنبیہ نہیں کی اور میں نے دِل لگا کر پڑھایا نہیں"۔ اس کے بعد میسیو ہامیل نے ایک طولانی تقریر میں ہمیں سمجھانا شروع کیا کہ فرانسیسی ہماری قومی زبان ہے اور اگر ہم نے اسے فراموش نہ کیا تو جرمنوں کی قید میں رہنے کے باوجود گویا قیدخانے کی کُنجی ہمارے پاس رہے گی۔ تقریر ختم ہوئی تو میسیو ہامیل نے قواعد پڑھانا شروع کی میں کیا کہوں کہ اس دن قواعد کتنی سہل معلوم ہو رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ نہ اُنھوں نے اس روز سے زیادہ واضح کسی دن سمجھایا تھا اور نہ ہم لوگوں نے اس سے زیادہ توجہ سے کبھی سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب کچھ چند گھنٹوں میں گھول کر پلا دینا چاہتے ہیں۔ قواعد کا سبق ختم ہُوا تو اُنہوں نے ہم سب کو ایک ایک نئی کاپی دی جس کے سرورق پر بخطِ جلی فرانس السّاس فرانس السّاس کچھ اس طرح لکھا ہُوا تھا کہ ان کاپیوں پر قومی جھنڈے کا گمان ہوتا تھا۔ اسکول پر سکوت طاری تھا ہر شخص خاموش بیٹھا ہُوا تھا اور قلم چلنے کی آواز کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہم لوگ خوش خطی کی مشق کر رہے تھے کہ اتنے میں کچھ تتلیاں

اندر آ گئیں لیکن ایک دفعہ نظر اُٹھا کر دیکھنے کے بعد چھوٹے سے چھوٹے بچے نے بھی دوبارہ ان پر نظر نہ ڈالی۔ میں جان توڑ کوشش کر رہا تھا کہ حروف خوبصورت بنیں اور جب کبھی اُنگلیوں کو سیدھا کرنے کے لئے ذرا کی ذرا دم لے کر میسیو ہامیل کے چہرے پر نظر ڈالتا تھا تو وہ بھی بے انتہا متاثر نظر آتے تھے۔ ان کا چہرہ اُداس تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسکول کی ہر ہر چیز کو اس یاس انگیز نظر سے دیکھ رہے ہیں گویا اب انہیں ان چیزوں کے دوبارہ دیکھنے کی امید نہیں ہے۔ اوپر کے کمرے میں میسیو ہامیل کی بہن ان کا اسباب ٹھیک کر رہی تھیں کیونکہ جرمنوں نے حکم دے دیا تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی ہمارے قصبے سے چلے جائیں اور جب کبھی کسی ٹرنک کے رکھنے کی بھاری آواز آتی تھی تو میسیو ہامیل چونک پڑتے تھے۔ خوش خطی کی مشق ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے الف۔ بے سنانا شروع کی اور انہیں کے ساتھ ضعیف العمر ہوسر بھی عینک لگا کر کتاب کھول کر ہجے کرنے لگے۔ ہوسر کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ ان کے پڑھنے پر ہنسنے کو بھی دل چاہتا تھا اور رونے کو بھی۔ بچے الف۔ بے ختم نہیں کرنے پائے تھے کہ گھڑی نے ٹن ٹن بارہ بجا دیئے۔ عین اسی وقت جرمنوں نے ہمارے اسکول کے نیچے بینڈ بجانا شروع کر دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ دل بھی۔ میسیو ہامیل کے چہرے پر دفعتہً زردی چھا گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے کرسی پر سے اُٹھے اور ہم لوگوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے "معزز دوستو! اور عزیز بچو! میں —— میں ——" معلوم ہوتا تھا کہ ان کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہے۔ ہم لوگوں کی آنکھ بچا کر رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بلیک بورڈ پر بہت بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا "**زندہ باد فرانس**" لکھنے کے بعد میسیو ہامیل اسی تختے سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور سر جھکا کر ہاتھ کے اشارے سے کہنے لگے "جاؤ اسکول بند ہو گیا"!

طالب صفوی

اے میری محبت، اے میری پرستش، اے اُن دو نفوس کی روشنی جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اے اُن دونوں کی ضیا جو ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں، اے اُن دو نگاہوں کی تنویر جو ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہیں، تو میرے پاس آئے گی؟ کیا تو نہ آئے گی! اے میری مسرت! وہ تنہائیوں میں ساتھ مل کر چلنا! وہ مسرور و منور دن! بعض اوقات میں نے خواب میں معلوم کیا ہے کہ کبھی کبھی چند ساعتیں فرشتوں کی زندگی سے جدا ہو کر یہاں زمین پر کچھ لوگوں کی قسمتوں میں نفوذ کر کے بسر ہوتی ہیں۔

وکٹر ہیوگو

انیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی انشاپرداز

اُنیسویں صدی کے آغاز میں فرانسیسی ادب کی بیداری رومانی تحریک[۱] سے شروع ہوتی ہے جس کے ساتھ وکٹر ہیوگو اور الگزینڈر ڈوما ایسے باکمال انشاپردازوں کے نام وابستہ ہیں۔ اُن ستاروں میں سے جو ہیوگو کے ہم عصر تھے قابل نقاد چارلس آگسٹن سیں بیو بہت شہرت رکھتا ہے۔

"چارلس آگسٹن سیں بیو"

سیں بیو ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۹ء میں وفات پاگیا۔ اُس نے اپنی ادبی زندگی ایک شاعر اور ناول نویس کی حیثیت سے شروع کی مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُسے معلوم ہوگیا کہ وہ ناول نویس کے بجائے ایک کامیاب نقاد ہے۔

سیں بیو پہلا ادبی نقاد تھا جس نے صحیح تنقید کے لئے عمیق مطالعے اور وسعت علم کو ضروری قرار دیا اور اس طرح تمام مروجہ اصُولوں کو مسترد کردیا۔ لارڈ مارلے کہتا ہے کہ فرانسیسی زبان سیکھنا صرف اُسی صُورت میں سُودمند ہوسکتا ہے کہ یہ زبان سیکھنے کے بعد سیں بیو کی تنقیدوں کا مطالعہ کیا جائے۔

سیں بیو کے دلچسپ ترین مضامین (Monday Talks) میں ملتے ہیں جو کتابی صُورت میں شائع ہونے سے پہلے اخباروں میں آرٹیکل کی صُورت طبع ہوا کرتے تھے۔ سیں بیو زیادہ تر صرف فرانسیسی انشاپردازوں کے افکار پر نقد و تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے کلاسیکل لٹریچر اور انگریزی ادیبوں کی کتابوں پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

سیں بیو نے ایک دفعہ کہا تھا "یہ میری خواہش رہی ہے کہ میں تنقید کے حُسن میں ایک نیا اضافہ کرسکوں اور اس کے ساتھ ہی اُس میں حقیقت کا عنصر بھی زیادہ سے زیادہ داخل کرسکوں"۔

اپنی زندگی میں سیں بیو کو ایک دفعہ ایک خشک مزاج ایڈیٹر سے واسطہ پڑا۔ بہت جھگڑوں کے بعد آخر ڈوئل تک

---

[۱] یہ تحریک جرمنی سے شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ فرانس تک پہنچ گئی۔ جرمنی کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں نے یونانی اور لاطینی اصول و قواعد سے جن کی تقلید پر اہلِ فرانس مٹے ہوئے تھے، انکار کردیا اور ادب کو اپنے دماغ کی مدد سے تیار کرنا شروع کیا۔ اس تحریک کی داستان بہت طویل ہے قصہ مختصر ہیگو نے جو ڈراما کیلئے یونانی اتحادِ ثلاثہ کی قید لگائی تھی اور جس پر والٹیئر نے اپنا سارا زورِ قلم خرچ کیا اس تحریک کی بدولت اُٹھ گئی اور یہ قاعدہ بھی کہ ٹریجیڈی کے ہیرو اور ہیروئن بادشاہ ملکہ اور شہزادیاں ہونی چاہییں حرفِ غلط کی طرح مٹادیا گیا اور اس امر پر زور ڈالا کہ پوشاکیں اس زمانے کے مطابق ہونی چاہئیں جس سے کہ وہ تعلق رکھتے ہیں۔

نوبت آگئی۔ چنانچہ دونوں میں ڈوئل ہوئی۔ اس نقاد کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھاتا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بیان کی کہ "مجھے مرجانا قبول ہے، مگر میں اس بارش میں بھیگنا نہیں چاہتا"۔

جارج سیں :-

ایمنڈائن لیوسلی اروما دیوپن، فرانس کی مشہور ادیبہ جس کا قلمی نام جارج سیں ہے ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئی اور ۱۸۷۶ء میں وفات پاگئی۔ اُس کا نام میوسط اور چوپن کے ساتھ عاشقانہ تعلق کی وجہ سے مشہور ہے۔ اُس نے ایک سَو کے قریب کتابیں لکھی ہیں۔

جارج سیں نے اپنی تصانیف میں بہت سے نئے الفاظ اختراع کئے ہیں جو اُس کے بعد بہت سے مصنفوں نے اپنی تحریروں میں استعمال کئے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک گسطاؤ فلابرٹ کے ساتھ خط وکتابت کرتی رہی۔ ان خطوط سے اُس کی ادبی لیاقت واضح طور پر نمایاں ہے۔

اُس کی تحریر نہایت شگفتہ اور سلیس ہے۔ اُس کی پہلی کتاب بہت مشہور ہے جس میں اس نے اپنی اور چوپن کی داستانِ محبت بیان کی ہے۔

پراسپر میریمی :-

'کارمن' نامی ایک مشہور رومان کا مصنف پراسپر میریمی ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۰ء میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ اُس کا نام صرف اسی ایک رومان کا مصنف ہونے کی وجہ سے مشہور ہے جس کو بعد ازاں تمثیلی شکل میں سٹیج پر کھیلا گیا ہے۔

میریمی نے مختصر افسانے اور چند ناول بھی لکھے ہیں مگر انہیں ادب میں بلند مرتبہ حاصل نہیں ہے۔

ہانری دی بالزک :-

بالزک ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۰ء میں اس جہان سے رُخصت ہوگیا گو وہ اپنے آپ کو اُس زمانے کی رومانیت سے علیحدہ تصور کیا کرتا تھا مگر یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اُس کی تحریر میں رومانی تحریک کا اثر بڑی حد تک موجود ہے۔

۱۸۴۲ء میں بالزک نے (Human Comedy) لکھنے کی ایک سکیم تیار کی۔ اُس کا ارادہ یہ تھا جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے: "میں انسانی ناولوں کی ایک تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہوں"۔ چنانچہ بالزک نے ہیومن کامیڈی سپردِ قلم کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھنے کا خیال اُسے ڈینٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوا۔

ہیومن کامیڈی مختلف حصّوں میں منقسم ہے یعنی گھریلو زندگی کے مناظر، شہری زندگی کی تصاویر، سیاسی زندگی کا عکس، پیرس کی زندگی کی تصویریں، فوجی زندگی کے منظر، فلسفیانہ مطالعہ اور تجزیہ نفسی۔ جیسا کہ بالزک کا خیال تھا یہ کتاب ایک سَو چالیس الگ الگ حصّوں میں مکمل ہوتی مگر وہ ایسا نہ کرسکا اس لئے کہ وہ اُس کے بیشتر مجوزہ حصّے نہ لکھ سکا۔

آج تک کسی مصنف نے ایسے وسیع پیمانے پر اپنے افکار کی تخلیق کا خیال نہیں کیا اور نہ کوئی مصنف آج تک اس قسم کی ضخیم کتاب تحریر کر سکا ہے۔

بالزک کو فرانسیسی ادب میں وہی رتبہ حاصل ہے جو چارلس ڈکنز کو انگریزی ادب میں ہے۔ بالزک کی بے شمار قلمی تصاویر میں صنفِ نازک کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہنری جیمز کہتا ہے "صنفِ نازک ہیومن کامیڈی کی روح و رواں ہے۔ اگر اس کتاب میں سے عورتوں کے کردار نکال لئے جائیں تو یہ لاثانی شاہکار بالکل بھدا ہو جائے گا ——"

سکاٹ کی طرح بالزک کی ادبی سرگرمیاں بھی مالی ضروریات کی زائیدہ تھیں۔ مگر یہ مالی مشکلات خود اسی کی پیدا کردہ تھیں۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ اُسے وکالت کی تعلیم دے مگر بالزک نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور ادب کو اپنا ذریعۂ معاش بنانے کا تہیہ کر لیا جس کی وجہ سے اُسے شروع شروع میں بہت مفلسی کی حالت میں زندگی بسر کرنا پڑی۔ ۱۸۲۵ء سے لے کر ۱۸۲۸ء تک وہ روپیہ پیدا کرنے کی مختلف تجاویز پر عمل کرتا رہا۔ اس عرصے میں اُس نے طابع، ناشر اور ٹائپ فونڈر کی حیثیت میں روپیہ کمانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس سلسلے میں وہ ایک لاکھ فرانک کا مقروض ہو گیا —— یہ رقم وہ دس سال کی مسلسل کوششوں کے بعد ادا کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس قرض کے ادا کرنے میں جو محنت اُسے برداشت کرنا پڑی وہ اس واقعے سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ وہ اکثر اوقات نصف شب سے لیکر دن کے چار بجے تک لکھنے میں مشغول رہا کرتا تھا۔

بالزک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُسے زندہ رہنے کا ذرا موقع نہیں ملا۔ وہ ہر وقت لکھنے میں مشغول اور قرض کی وجہ سے پریشاں رہتا تھا۔" اُس کی مالی مشکلات کی زیادہ تر وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ بہت فضول خرچ واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایسے امور پر بے دریغ روپیہ بہا دیا کرتا تھا جن کے متعلق وہ اچھی طرح علم و واقفیت نہ رکھتا تھا۔

گسطاو فلابرٹ :-

فلابرٹ نارمن نسل سے تھا۔ وہ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۱ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک ایک کتاب "مادام بوواری" لکھنے میں مصروف رہا جو فرانسیسی ادب میں حقیقت نگاری کا بہترین شاہکار ہے۔

"مادام بوواری" انیسویں صدی کے وسط کی شہری زندگی کی ایک تصویر ہے۔ یہی زندگی وہ ماحول تھا جس میں اُس نے پرورش پائی تھی اور جسے وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ گو فلابرٹ طبقۂ اعلےٰ سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ امراء کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ "مادام بوواری" میں اُس نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ طبقۂ اعلےٰ کا کوئی فرد بغیر انفرادی صلاحیتوں کے جب اُس دُنیا کو چھوڑ کر جس میں وہ آباد ہے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، ہمیشہ نفرت انگیز ہوا کرتا ہے۔"

"مادام بوواری" کی چند نمایاں خصوصیتیں یہ ہیں :-

بتیز مشاہدہ ، اُن نتیجوں کے سمجھنے کی قدرت جو عام مردوں اور عورتوں کے افعال کے محرک ہوتے ہیں ، طرزِ نگارش کی خوبصورتی اور دو عام اشخاص میں تمیز کرنے کا فن ۔

اسی کتاب کو شائع کرنے کی بنا پر فلابرٹ عدالت میں پیش ہوا ۔ الزام یہ تھا کہ مادام بوواری مخرب اخلاق کتاب ہے مگر یہ کتاب درحقیقت پُراز اخلاق ہے جب کہ اس کا واحد سبق یہ ہے کہ انسان کو اپنی قسمت کی حدود کے اندر مطمئن زندگی بسر کرنی چاہیئے ۔

۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیانی عرصے میں فلابرٹ (The Temptation of st. Anthony) اور (Salammbo) لکھنے میں مصروف رہا جو ۱۸۶۲ء میں طبع ہو کر لوگوں کے سامنے پیش ہوئیں ۔

فلابرٹ بھی مولئیر اور بالزک کی طرح فرانسیسی اکیڈمی کا رُکن نہ تھا ۔ گو مادام بوواری کے مصنف کو ادب میں حقیقت نگاری کے ایک ماہر کی حیثیت سے جگہ ملنی چاہیئے ۔ مگر فلابرٹ عارضی طور پر ایک رومان نویس بھی تھا ۔ وہ رنگ اور روشنی کا چاہنے والا تھا ، اور اس کے علاوہ اسرار بھی اُس کے لئے بہت دلچسپی رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے مادام بوواری تصنیف کرنے کے بعد (Salammbo) لکھی جس میں اُس نے قدیم (Carthage) کی ازسرِنو تخلیق کی ہے ۔ جب فلابرٹ نے یہ کتاب لکھنی شروع کی اُس نے اپنے ایک دوست سے کہا " میں بدنما اشیا اور بیہودہ ماحول سے سخت اُکتا گیا ہوں ۔ اب میں کچھ عرصے کے لئے ایک نئے اور دلکش مضمون میں غوطہ زن رہ کر اس جدید دُنیا سے دُور رہنا چاہتا ہوں "

فلابرٹ کی وہ خط و کتابت جو ایک عرصہ تک جارج سین کے ساتھ ہوتی رہی تھی اُس کی وفات کے بعد شائع ہوئی ۔ یہ خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کس پایہ کا ادبی صناع تھا ۔

فلابرٹ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ کی نشست اور اُن کی خوبصورتی پر بہت توجہ دیا کرتا تھا ۔ وہ خوبصورت طرزِ نگارش کا اتنا مشتاق اور دلدادہ تھا کہ آخر میں اُس نے نفس مضمون کو بالکل نظر انداز کر دیا ۔ اُس نے ایک دفعہ اپنے ایک دوست کو لکھا " میں ایک ایسی کتاب لکھنا پسند کروں گا جس کا نفس مضمون کچھ بھی نہ ہو جس کا وجود صرف طرزِ نگارش ہو ۔ جیسا کہ کرۂ زمین ہوا میں بغیر کسی سہارے کے معلق ہے " ۔

فلابرٹ کے افکار کا فرانسیسی ادب پر بہت اثر ہوا ۔ زولا ، دودے اور دی گونکور تینوں اُسی کے تتبع میں لکھنے والے ہیں ۔

ایمل زولا :۔

ایمل زولا کا باپ نصف اطالوی اور نصف یونانی تھا ۔ زولا پیرس میں ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا ۔ وہ ابھی کم سن ہی تھا کہ والد کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ گیا ۔ افلاس کی بہت تکالیف جھیلنے کے بعد بمشکل اُسے ایک پبلشر کے یہاں منشی کا کام ملا جہاں اُسے فی ہفتہ ایک پونڈ ملا کرتا تھا ۔ یہ ۱۸۶۲ء کا ذکر ہے مگر تین سال کے بعد ایک اخبار میں اُس کا ایک افسانہ شائع ہوا جو بہت قدر کی

نگاہوں سے دیکھا گیا۔ چنانچہ اُس نے افسانہ نویسی کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۶۴ء میں اُس نے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا جو سب کے سب جذباتی و مثالی تھے۔

کچھ عرصے کے بعد زولا نے (Rougan-Macquart) کے نام سے ناولوں کا ایک سلسلہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں عام خاندانوں کے افراد کی زندگی کی تصویر کشی کرے۔ چنانچہ وہ اِس مجوزہ سکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے تیس سال تک لگاتار لکھتا رہا۔

اس سلسلے کی ہر کتاب عمومی زندگی کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ (Ventre de Paris) میں بازاروں کا ذکر ہے (L'Assommoir) میں شراب خانوں کا (La Bete Humaine) میں ریل گاڑیوں کا تذکرہ ہے، (Germinal) کانوں میں مزدوروں کی زندگی پیش کرتی ہے۔ (L'Argent) دنیائے مالیات سے تعلق ہے (La Debacle) ۱۸۷۰ء کے دہشت خیز حادثات بیان کرتی ہے اور (Lourdes) میں مذہب کے توہمات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زولا اپنے عزم کو مختصراً بدیں الفاظ بیان کرتا ہے "میں ایک خاندان کو پیش نظر رکھ کر اُس کے ہر فرد کا بغور مطالعہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرف رجوع کرتے ہیں اور کس طرح وہ ایک دوسرے کے خلاف حرکات عمل میں لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے کرداروں کو ایک خاص تاریخی وقت میں پیش کروں گا تاکہ مجھے ایک اچھا ماحول مل سکے —— یعنی تاریخ کی ایک ہلکی سی چاشنی"

زولا کا مقصد اپنے وقت کی صحیح تصویر کشی کرنا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اِس لئے کہ اُس نے اپنی تصانیف میں صرف انسانی کمزوریوں اور برائیوں ہی کا تذکرہ کیا ہے۔

زولا بسیار نویس اور محنت کش تھا۔ اُسے اپنی زندگی میں بہت مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ سب سے بڑی مایوسی جو جو اس فرانسیسی انشا پرداز کی راہ میں حائل ہوئی یہ تھی کہ وہ اکاڈیمی کا رُکن بننے کی سعی میں ناکام رہا۔

زولا کی طرز نگارش بہت بلند نہیں ہے مگر اُس کے مختصر افسانوں میں ہمیں اُس کے تخیل کے نادر نمونے ملتے ہیں جنہیں ادب میں بہت ممتاز جگہ حاصل ہے۔

زولا کا ۱۹۰۲ء میں انتقال ہؤا اور وہ پیرس میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

الفانسے دوڈے:-

دوڈے ۱۸۴۰ء میں پیدا ہؤا۔ سولہ سال کی عمر میں اُسے مالی مشکلات کی بنا پر ایک اسکول میں ایک معمولی معلم کی نوکری حاصل کرنا پڑی۔ ایک سال کے بعد ہی وہ یہ ملازمت چھوڑ کر پیرس روانہ ہو گیا جہاں اُسے ایک اخبار کے عملے میں جگہ مل گئی۔ دو سال یا اس سے کچھ کم عرصے کے بعد وہ نپولین سوم کے سوتیلے بھائی کا سیکرٹری بن گیا اور اس حیثیت میں ۱۸۶۵ء تک کام کرتا رہا۔

اسی دوران میں اُس نے ادبی حلقے میں اپنی مشہور کتاب (Roisen Exil) سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

دوؔدے کو اکثر فرانسیسی ڈکنز کا نام دیا جاتا ہے۔ اُس کی تصنیف (de Petit chose) جس میں اس انگریزی ادیب کی پوری جھلک موجود ہے اس امر پر شاہد ہے کہ وہ واقعی اس نام کا اہل تھا۔ اُس کی حقیقت نگاری کا راز اس حقیقت میں موجود ہے کہ اُس کی تصانیف کے اکثر کردار گردوپیش کی زندگی میں سے چُنے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر (Mallatta hek) اکادمی کے ارکان پر ایک حملہ ہے جس کے بیشتر کردار و حادثات حقیقی زندگی میں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

زولا کی طرح داؔدے بھی بہت محنت کش اور بسیار نویس تھا۔ وہ اکثر اوقات صبح چار بجے سے لکھنے میں مشغول ہوتا اور آٹھ بجے تک لکھتا رہتا۔ نو بجے لکھنا شروع کرتا اور بارہ بجے تک اپنے کام میں منہمک رہتا، دو بجے پھر قلم پکڑ کر چھ بجے تک لکھتا رہتا اور تھوڑا عرصہ آرام کرنے کے بعد وہ پھر آٹھ بجے سے لے کر نصف شب تک اپنے کام میں مشغول رہتا۔

داؔدے نے اپنی زندگی کے ایام بہت خوشی میں کاٹے۔ اُس کی ازدواجی زندگی پُر از مسرت تھی۔ داؔدے پیرس میں ۱۶ دسمبر ۱۸۹۷ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

الفرڈ دی میوسط:-

وکٹر ہیوگو کے ادبی حلقے کا سب سے کم عمر ممبر تھا۔ شروع شروع میں نوجوان میوسط اُس ادبی حلقے کو ایک شرابی کی نقل اُتار کر محظوظ کیا کرتا تھا —— اس وقت اُس کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔

میوسط پیرس میں ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ اعلےٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک حد تک اچھی شہرت کا ادیب تھا۔ وکٹر ہیوگو نے شروع شروع میں نوجوان شاعر کی حوصلہ افزائی کی مگر میوسط کا رجوع بائرن کے سکول کی طرف تھا جس کا کلام اُسے زبانی یاد تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی اکثر منظومات اُسی کے تتبع میں کہی ہیں۔

میوسط کی ابتدائی شاعری فکر کی گہرائیوں سے خالی ہے مگر ۱۸۳۲ء میں جب وہ جارج سینڈ کے ساتھ وینس میں بھاگ کر چلا گیا —— اور اُس برقی زندگی کے بعد وہ دونوں ایک غم افزا حالت میں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ اُس کے تمام افکار بالکل بدل گئے۔ طبیعت میں سنجیدگی اور گہرائی خود بخود پیدا ہو گئی —— محبت کے جذبات، غصہ اور حسد نے اُس کے دل و دماغ کو تار تار کرنا شروع کر دیا۔

میوسط نے بائرن کی طرح لوگوں کی ہمدردی کو منعطف کرانے کی خاطر اپنے مجروح دل کی قاشیں پیش کرنا شروع کیں۔ اُس کے شدید ترین جذباتِ اُلفت گائے نہیں جا سکتے۔ میوسط خود کہتا ہے "اگر میں اِن جذبات کو گیت کی صورت میں پیش کرنے کی سعی کروں تو وہ اسے نازک پتیوں کی طرح کچل کر رکھ دیں گے۔"

میوسطہ کے افکار سحر انگیز، مترنم اور رومان آفریں ہیں — یہی وہ سحر خیز قدرت تھی جس نے اُسے اپنے زمانے کا بہترین شاعر بنا دیا۔ اُس کے گیت خالص حُسن کی وجہ سے فرانسیسی شاعری کے گوہر تصور کیئے جاتے ہیں۔

تھیوفل گوتیئے :۔

گوتیئے طاربز میں پیدا ہُوا مگر جوان ہوتے ہی پیرس میں چلا آیا جہاں اُس نے بہت غریبی کی حالت میں زندگی بسر کرنا شروع کی۔ اِن دنوں وہ اکثر اوقات دِن کا بیشتر حصّہ تصویر خانوں میں صرف کیا کرتا تھا۔ وہ اِن تصویر خانوں کی دیواروں پر آویزاں تصاویر کو گھنٹوں بُت بنا ہُوا دیکھتا رہتا — غالباً وہ اپنی روح کو رنگوں اور حُسنِ تشکیل کی غذا دیا کرتا تھا۔

اِن تصاویر اور اصنام کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر گوتیئے نے تصویر کشی کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے حسین خوابوں کی صحیح تعبیر کپڑے کے ٹکڑے پر پیش نہیں کی جا سکتی تو اُس نے بُرش اور رنگوں کو یک قلم موقوف کر کے لفظوں کی صنعت کی طرف توجہ دی — وہ آرٹ جس کا اُسے لاثانی ماہر ہونا تھا۔

ایک زمانے میں جب وہ صحافت نگاری سے گزر اوقات کر رہا تھا، وہ چند رومانی منظومات قلمبند کرنے میں مشغول تھا جن کا ہر ہر لفظ تصویر پر ایک مصوّر کے قلم کی جُنبش سے کم نہیں ہے۔

گوتیئے کا آرٹ خواہ وہ نظم کی صُورت میں ہو یا نثر کی صُورت میں بالکل یونانی ہے۔ درصل وہ یونانی آرٹ کا بہت دلدادہ تھا اور اس آرٹ کے متعلق اُس نے اپنی چند تصانیف میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔

گوتیئے نے انگلستان کے مشہور جواں افکار شاعر کیٹس کی طرح ایک نظم لکھی ہے جس میں ہر ایک چیز سفید ہے (کیٹس نے اپنے سانیٹ کے لئے نیلا رنگ منتخب کیا تھا) یہ نظم ایک دوشیزہ کی تصویر ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس، تالاب میں نہاتی ہوئی بطخوں کے پروں سے بھی زیادہ سفید — چاندنی رات میں تیرتی ہوئی برفانی چٹان اور — موتیا کی سیمین پنکھڑیوں سے بھی زیادہ سفید — یہ دوشیزہ اپنے پیانو کے پاس بیٹھ کر اپنے سفید ہاتھوں سے جو ہاتھی دانت کے بنے ہوئے پردوں سے بھی زیادہ سفید ہیں، اُس ساز کو چھیڑتی ہے۔

آرٹ اور صرف آرٹ کی تخلیق گوتیئے کا منتہائے نظر تھا۔

چارلس بادلئیر :۔

بادلئیر پیرس میں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہُوا اور ۱۸۶۷ء میں وہیں سپردِ خاک ہُوا۔ چونکہ بادلئیر صاحب جائداد تھا اس لئے وہ اس قابل تھا کہ اپنی زندگی شاعری کے لئے وقف کر دے۔ مگر اس کے باوجود اُس کے تمام اشعار صرف ایک جلد پر مشتمل ہیں جو Les Fleurs du Mal (Flowers of Evil) کے نام سے مشہور ہے۔

بادلیئر نہ ستور شاعر تھا اور نہ حسین اشیا کو تلاش کرنے والا ——— وہ سیاہ چیز کو سفید پر ترجیح دیتا تھا۔ اُس کی نظروں میں، ایک لڑکی جس نے آغوشِ غربت میں پرورش پائی ہو اور جس کے پھٹے ہوئے غلیظ کپڑوں میں سے اُس کے کمزور بدن کی ہڈیاں نظر آرہی ہوں، کسی دوسری حریر پوش حسینہ سے زیادہ حسن و جمال کی مالک تھی۔

بادلیئر کی شاعری، دہشت اور بدصورتی اور اُن مہالک سے جورات کے وقت منڈلاتے ہیں اور اُن بھوتوں کی تصاویر سے جو رُوح کی تاریک گہرائیوں میں داخل ہوتے ہیں، بھری پڑی ہے۔ دراصل جب بادلیئر کوئی تصویر پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بالکل غیر فطری ہوتی ہے مثال کے طور پر "پیرس میں ایک خواب" میں ہم ایک ایسا شہر دیکھتے ہیں جو سنگِ مرمر اور دھات کا بنا ہوا ہے۔ جس کے بلند مینار اپنی پُراسرار روشنی سے منور ہیں۔ آبشار بلوریں پردوں کی طرح گرتے ہیں، نیلے پانی کے تالاب آہنی شیشوں کے مانند ہیں ——— باقی نظم بھی اسی قسم کی عجیب تشبیہوں سے بھری پڑی ہے۔

بادلیئر کی شاہراہ دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خوشبوؤں کا شاعر تھا اور تصویروں سے اُسے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "میری روح خوشبوؤں پر تیرتی ہے، جیسا کہ دوسرے لوگوں کی موسیقی پر"۔

اُس کے اکثر اشعار پیچیدہ ہونے کے سبب سے ناقابلِ فہم ہیں۔

پال ورلین:-

ورلین اپنی نوعیت کا پہلا شخص ہے جس نے شاعری میں نام پیدا کیا۔ وہ اس قدر بدشکل واقع ہوا تھا کہ عورتیں اُسے دیکھتے ہی دہشت کے مارے چیخ اُٹھتی تھیں گویا وہ جنگلی بندر ہے۔ گو اُسے ایک دفعہ اپنے دوست پر گولی کا نشانہ کرنے کے جُرم میں جیل کی ہوا کھانی پڑی اور دوسری دفعہ اپنی ماں پر حملہ آور ہونے کی وجہ سے سپردِ زندان ہونا پڑا اور اُس کی موت انتہا درجے کی سوختہ سامانی میں واقع ہوئی مگر اُس کے اشعار اپنی خوبصورتی اور سادگی کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ کوئی فرشتہ اُنہیں اپنے ساز پر گائے۔

ورلین ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور تادمِ آخر (۱۸۹۶) پیرس میں سکونت پذیر رہا۔ اُسے ورثے میں کچھ روپیہ حاصل ہوا تھا جو اُس نے اپنی ننھی ننھی کتابوں کی اشاعت پر خرچ کر دیا۔ یہ کتب یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب (Saturnion Poems) کے نام سے شائع ہوئی ——— یعنی منظومات جن کی تخلیق سرطان نامی غم افزا ستارے کی موجودگی میں ہوئی۔ ان اشعار میں غم تو ضرور ہے مگر شیریں اور سحر انگیز۔

ورلین کے پیشِ نظر صرف اپنی پُراسرار روح کے غم اور خوشیاں بیان کرنا تھیں لیکن وہ جس چیز کا بھی اظہار کرتا ہے، خواہ محبت کے گیت ہوں یا شراب کی مدح، خواہ ہسپتال یا جیل کے افکار ہوں۔ یا اپنے گناہوں، خوابوں یا اپنی جہالتوں کا ذکر ——— یہ سب ایسے سُریلے اور شیریں اشعار میں بیان کئے گئے ہیں کہ رُوح بے اختیار وجد کرنے لگ جاتی ہے۔

سعادت حسن

والٹیئر

فرانسس ماری اروئے جو ادبی دُنیا صرف والٹیئر کے مختصر نام سے متعارف ہے پیرس میں ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کو پیدا ہوا۔ اُس کا باپ متموّل آدمی تھا۔ والٹیئر نے ابتدائی تعلیم (Jesuit College) ایسی نامی درسگاہ سے حاصل کی۔ گو یہ تعلیم پادریوں کے زیرِ اثر تھی مگر جیسا کہ اناطول فرانس اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ کلیسا کے بدترین دُشمن وہ ہوتے ہیں جو اُس کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں، ہم اُس کی زندگی کا بیشتر حصّہ پادریوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے میں صرف ہوتا دیکھتے ہیں۔

شاعر، مورخ اور فلسفی کی حیثیت میں تو والٹیئر کے مقابلے میں چند اشخاص پیش کیئے جا سکتے ہیں مگر طنزیہ نگاری اور ہجو گوئی میں اُس کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ اس کے مشرقی رومان یا کہانیاں الف لیلہ کی طرز میں لکھی گئی ہیں۔

والٹیئر کی حاضر جوابی اور طنز گوئی کے متعلق بہت روایتیں مشہور ہیں۔ لوئی چہاردہم کے مرنے کے بعد جدید ناظم نے کفایت کی غرض سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے فروخت کر دیئے۔

والٹیئر نے وہ واقعہ سُن کر کہا "اس سے کہیں بہتر تھا کہ شاہی دربار سے نصف گدھوں کو نکال دیا جاتا۔"

۱۷۷۰ء میں اُس کا مجسّمہ قائم کرنے کے لئے چندے کی فہرست کھولی گئی۔ اس وقت والٹیئر کے چہرے کی رونق بڑھاپے کی نذر ہو گئی تھی۔ رخسار پچک گئے تھے۔ بدن کی یہ حالت تھی گویا پُرانا چمڑا بوسیدہ ہڈیوں پر منڈھا ہے۔ آخر جب مجسّمہ تیار ہو گیا تو والٹیئر نے شاہ فریڈرک کو لکھا "مجھے اب معلوم ہؤا ہے کہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ آپ علمِ ابدان کے سرپرست بھی ہیں جبھی تو میرا مجسّمہ تیار کرا کے جسم کا ڈھانچ مطالعہ کے لئے پیش کر دیا ہے۔"

والٹیئر اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، مفکّر، تمثیل نگار اور ادیب تھا۔ فرانس کے عہدِ حاضر کے مشہور نوبل پرائز یافتہ انشا پرداز اناطول فرانس کے خیال میں جنسِ لطیف کی آئینہ برداری میں شیکسپیئر بھی والٹیئر سے لگا نہیں کھا سکتا۔ والٹیئر المیہ تمثیل نگاری کا بادشاہ ہے انگلستان کا شہرۂ آفاق شاعر ٹامس گرے گو دہریہ خیال والوں سے متنفر تھا مگر پھر بھی وہ والٹیئر کی ٹریجیڈی کو شیکسپیئر کی تمثیلوں کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔

"والٹیئر مشہور صحافی بھی تھا۔ وہ بہت کثرت سے خطوط لکھتا۔ اُس نے ایک سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ اُس کی تصانیف میں ایک لفظ بھی مہمل یا بیہودہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت تک اُس کے دس ہزار مکتوب شائع ہو چکے ہیں۔"

"اگر والٹیر کی تمام کتابیں سوائے "کینڈ یڈ" کے تلف کر دی جائیں تو بھی وہ فرانس کے ادیبوں کی صف اوّل میں جگہ پاتا ہے - یہ کتاب در اصل روسو کے ایک مکتوب کا جواب ہے جس میں روسو نے اُسے بے دین اور ملحد قرار دیا تھا - اس تصنیف میں وہ تمام جسمانی گناہوں کا نقشہ اور انسانی تباہی و بربادی کی تصویر کھینچ کر اس بری طرح مضحکہ اُڑاتا ہے کہ پڑھنے والا خود بخود مصنف کا شریک تبسم ہو جاتا ہے"

والٹیر کے آہنی قلم نے آسمانی صحیفوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا - اُس کے ذہن نے مذہب، فلسفے اور تاریخ کے میدانوں کو اپنی جولانگاہ بنایا - نثر، نظم، تاریخ، افسانہ، رومان اور تمثیل میں ہر جگہ والٹیر مذہب کی مخالفت کرتا ہے ـــ کلیسا حکومت کی گاڑی کا سب سے مضبوط گھوڑا تھا - والٹیر کی بیدزنی سے وہ ادھ مُوا ہو گیا - حکومت کی گاڑی رُک گئی مگر والٹیر اُسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا -

اُس کے نزدیک شخصی یا جمہوری حکومت میں کوئی فرق نہیں - غربا کے لئے دونوں باتیں یکساں ہیں - خواہ اُنہیں ایک شیر شکار کرے یا ایک ہزار چوہے اُن کے متاعِ زیست پر ڈاکہ ڈالیں[1] -

والٹیر کی زندگی کے حالات پر جس کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، اُس کی مثال نپولین کے سوا شاید ہی کوئی ہو - آخری عمر میں والٹیر نے اپنی پژمردہ قوت کو ابھارنے کے لئے شراب کا کثرت سے استعمال شروع کر دیا تھا - اس کے اثر کو زائل کرنے کی خاطر اُس نے بعد ازاں افیون کھانا بھی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی رہی سہی صحت بھی برباد ہو گئی - آخر ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء میں یہ باکمال شخص وفات پا گیا - اُس کے مرتے ہی یہ احکام جاری ہو گئے کہ اسے کسی گرجا میں دفن نہ کیا جائے - مگر والٹیر کے احباب نے اُس کی لاش کو رسوم کے بغیر مضافات کے ایک گرجا میں خفیہ طور پر دفن کر دیا - اُس کی لوحِ مزار پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

"یہاں والٹیر آرام فرما ہے"

بعد میں فریڈرک اور دیگر مشاہیرِ یورپ نے پادریوں کو بہت لعن طعن کی اور اکادیمی نے نفرت کا ووٹ پاس کیا ـــ مؤرخ اس واقعہ کو انقلابِ فرانس کا محرک و ممد خیال کرتے ہیں -

سعادت حسن

تم ستاروں کو دیکھتے ہو اس لئے کہ وہ منور ہیں اور ناقابلِ فہم مگر تمہارے پہلو میں اُن سے زیادہ نرم روشنی اور اُن سے زیادہ عظیم اسرار موجود ہے ـــ عورت!

(وکٹر ھیوگو)

---

[1] انقلابِ فرانس مصنفہ باری (علیگ)

والٹیئر کی صد سالہ برسی پر وکٹر ہیوگو کی تقریر

(یہ تقریر پیرس میں ۳۰ مئی ۱۸۷۸ء کو والٹیئر کی صد سالہ برسی کے موقع پر کی گئی)

ایک سَو برس کا عرصہ گزرا آج ہی کے دن ایک شخص نے انتقال کیا تھا۔ وہ مرگیا لیکن ہم آج اس کو یاد کررہے ہیں اور ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔ وہ ہمارے لئے کیا چھوڑ گیا ہے؟ اپنے قابلِ یادگار کارنامے اپنی نہایت ہی مشکل اور خوفناک ذمہ داریاں، انسانی ضمیر کی تاابد قائم رہنے والی ذمہ داریاں۔ زندگی میں اسے لعنتیں بھی ملی تھیں اور دعائیں بھی۔ ماضی نے اس پر لعنتیں بھیجیں اور مستقبل نے دعائیں۔ اور حضرات سچ پوچھئے تو عظمت اور کمال کی یہی سب سے بڑی نشانیاں ہیں۔ بستر مرگ پر اس کے ایک ہاتھ میں آنے والی نسلوں اور اپنے ہمعصروں کا نعرۂ مسرت تھا اور دوسرے ہاتھ میں نفرت و ذلت پر وہ عظیم الشان فتح تھی جو ملک نے اس کے سامنے پیش کی تھی۔ اس کی ہستی معاشری دائرہ سے باہر تھی۔ وہ خود ایک دَور تھا اس نے اپنا پیام دُنیا کو سُنایا۔ اس نے اپنا مشن دُنیا کے سامنے دلیری سے پیش کیا۔ کس نے اسے اس کام کے لئے منتخب کیا تھا؟ اس عظیم الشان طاقت نے جس کی روح صرف قانونِ انسانی ہی میں نہیں بلکہ قانونِ قدرت میں بھی برسرِ عمل رہتی ہے۔

زندگی کے اس مختصر چوراسی سال میں اس نے بہت کچھ دیکھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے شخصی حکومت کا تاریک بادل چھٹ گیا اور انقلاب کا آفتاب طلوع ہوا۔ جب وہ پیدا ہوا تو لوئی چہاردہم کی حکومت تھی اور جب اس نے انتقال کیا تو لوئی چہاردہم کا پوتا تخت پر تھا۔ اس طرح قدرت نے انتظام کردیا کہ اس کا پالنا شخصی حکومت کا عروج دیکھ لے اور اس کا تابوت اس کمال کی تاریک خلیج سے بھی روشناس ہوجائے۔

حضرات! انقلاب سے پہلے ہماری معاشرتی حالت یہ تھی:۔

سب سے نیچے عوام

عوام کے اوپر مذہب کا نمائندہ چرچ

مذہب کے پہلو بہ پہلو انصاف مجسٹریٹوں کی شکل میں۔

انسانی معاشرت کے اس عہد میں عوام کیا تھے؟ ——— جہالت۔ مذہب کیا تھا؟ ——— تعصب۔ انصاف کیا تھا؟ ———

ظلم۔ معاف فرمائیے میں شاید حد سے بڑھا جارہا ہوں۔

میں آخری دو حقیقتوں پر بحث کروں گا۔ ٹولاوز میں ۱۳ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو ایک جوان ایک نیچے مکان میں مردہ پایا گیا۔ موت رسی کے پھندے کے ذریعہ سے عمل میں آئی تھی۔ ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ پادریوں نے شہر میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ حکومت نے واقعہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ ایک خودکشی کا واقعہ تھا لیکن اسے ایک قتل کی صورت میں پیش کیا گیا۔ کس لئے؟ —— مذہب کے فائدہ کے لئے اور جرم کس پر عاید کیا گیا؟ —— غریب باپ پر، صدیوں سے جو رنیم جاں باپ پر!۔ وہ ایک ہیوگونوٹ[1] تھا اور اس نے بیٹے کو کیتھولک ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ کتنی بعید از قیاس بات تھی۔ کتنا غیر ممکن جرم تھا۔ باپ نے بیٹے کو مار دیا نہیں بلکہ باپ نے اپنے اکلوتے بچے کو پھانسی دے دی۔ تحقیقاتیں ہوتی رہیں اور انجام یہ ہوا —— ماہ مارچ ۱۷۶۲ء میں جین کلاس، ایک بوڑھے آدمی کو جس کے سر کا ایک ایک بال سفید تھا جیل میں لے جایا گیا۔ اس کے ننگے بدن پر کوڑے مارے گئے۔ اسے ایک چکر پر لٹا دیا گیا۔ جسم چکر سے باندھ دیا گیا لیکن سر لٹک رہا تھا۔ اس حیوانی فعل کو دیکھنے کے لئے وہاں صرف چھ آنکھیں رہ گئی تھیں۔ ایک مجسٹریٹ جس کے ذمہ یہ کام تھا۔ ایک پادری آخری وقت دُعا کرنے کے لئے۔ اور ایک جلاد جس کے ہاتھ میں ایک لوہے کی سیخ تھی۔ تکلیف کے عالم میں مجرم کی نگاہیں خدا اور مذہب کے در پر نہیں بلکہ حکومت کے در پر رحم کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہیں۔ جلاد لوہے کی سیخ اُٹھاتا ہے اور مضبوط ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے غریب مجرم کا ایک ہاتھ جسم سے الگ ہو کر تڑپنے لگتا ہے۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو جاتا ہے دوائیں سنگھائی جاتی ہیں تاکہ ہوش میں آئے۔ سیخ کا دوسرا وار ہوتا ہے۔ بیہوشی پھر طاری ہوتی ہے اور پھر ہوش میں لایا جاتا ہے۔ ہر عضوِ بدن کو سیخ کے دو دو وار جسم سے الگ کرتے ہیں۔ مجرم کی رُوح آٹھویں وار میں جسم کو چھوڑ دیتی ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اسے دعاؤں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ اچھی طرح مار ڈالنے کے لئے سیخ کا نوکیلا حصہ اُس کے سینہ میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔ سزائیں دو گھنٹے جاری رہتی ہیں۔ سنئے! اس کی موت کے بعد جوان کے خودکشی کرنے کا ثبوت مِل جاتا ہے لیکن روح جسم میں دوبارہ واپس نہیں آسکتی قتل سرزد ہو چکا تھا کس سے؟ —— خود ججوں سے!!

دوسرا واقعہ۔ بوڑھے کے بعد جوان کا تین سال گزر گئے۔ ایک طوفانی رات کے بعد ایک پُل کی سڑک پر ایک لکڑی کی خستہ صلیب پڑی ہوئی پائی گئی جو تین صدی سے نہر کی پٹڑی پر نصب تھی۔ کس نے اس صلیب کو پھینکا تھا؟ —— کس نے دیکھا تھا؟ شاید کسی مسافر ہی نے پھینک دیا ہو لیکن یہ ایک فعل تھا جو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پاک اور مقدس مذہب سے جس نے رحم کی تعلیم دی ہے۔ جو ایک طمانچہ کے بعد دوسرا گال پیش کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ بشپ آف آمین نے شہر میں MONITOIRE[2] کا

---

[1] عیسائیت کے دو فرقے جن میں ایک زمانہ میں سخت اختلاف بلکہ دشمنی تھی۔ شمسی

[2] یہ ایک مذہبی قانون ہے جس کی رو سے کسی جرم کی تفتیش کے سلسلے میں بشپ ہر شخص سے حلفاً اقرار کرنے کا مجاز ہے۔ یہ خاص کیتھولک قانون ہے۔ شمسی

حکم صادر کردیا۔ طرح طرح کی افواہیں شہر میں پھیلنے لگیں حکومت نے مجرم کا پتہ لگالیا اپنے خیال ہی میں سہی۔ اس طرح کہ اس رات کو دو افسر اس پُل پر سے گزرے تھے۔ نشہ نے انہیں جامہ سے باہر کر رکھا تھا اور شاید وہ گانا گاتے ہوئے بھی سُنے گئے تھے۔ وارنٹ صادر ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے بھاگ کر جان بچائی اور دوسرا غریب لابیر گرفتار کرلیا گیا۔ مقدمہ چلتا رہا۔ چرچ نے اسے مجرم ٹھیرایا۔ مقدمہ کی اپیل پارلیمنٹ میں پیش ہوئی لیکن فیصلہ بحال رہا ——— میں مختصر کہہ رہا ہوں ——— وہ سزا دینے کے کمرے میں لایا گیا۔ اس پر سزاؤں کی بوچھاڑ شروع ہوئی معمولی اور غیر معمولی ہر طرح کی تاکہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا نام ظاہر کردے۔ کیسے ساتھی؟ ——— وہ جو اس کے ساتھ پُل پر سے گزرے تھے اور گانے میں اس کے شریک تھے۔ سزا کے دوران میں اس کی ایک ٹانگ توڑ دی گئی۔ پادری سزا کو دیکھ کر بیہوش ہوگیا۔ غریب مجرم کی کیا حالت ہوگی؟ دوسرے دن یعنی پانچویں جون ۱۷۶۶ء کو وہ ایک میدان میں لایا گیا جہاں آگ دہک رہی تھی۔ اور اسے سزا کی خبر سنائی گئی۔ جلاد نے اس کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ اس کی زبان گرم لوہے سے داغ دی گئی۔ اور آخر میں رحم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا سر تن سے جُدا کردیا گیا۔ یہ تھی وہ تلخ موت جو جوان لابیر کو نصیب ہوئی۔ انیس برس کے سن میں کون ایسی موت پسند کرتا ہے؟

اس وقت والٹیر نے ایک دردناک چیخ ماری۔ سارا فرانس بلکہ ساری دُنیا اس سے جاگ اُٹھی۔ والٹیر یہ تیرا اچھا کارنامہ ہے۔ تو نے ماضی کے ان ظلموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ تو نے دُنیا کو ہوشیار کردیا شیطانوں اور ظالموں کی ناپاک روح سے تو نے نسل انسانی کی بھلائی چاہی اور کامیاب رہا۔ اے قابلِ ستائش ہستی تجھ پر خدا کی رحمتوں کا نزول ہو!

حضرات! یہ جاں گسل نظارے کہاں رونما ہو رہے تھے؟ ——— یورپ کے ایک نہایت ہی شائستہ ملک میں۔ زندگی دلچسپیوں سے بھری تھی۔ عوام حالات سے بے خبر تھے۔ انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ ان کے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے۔ ان کی یہ بے خبری انہیں زوال کی طرف کھینچ رہی تھی۔ بڑے بڑے شعرا (GENTIL-BERNARD، BOUFFLERS و St. ANLBIRE) اپنے اپنے نغمے گا رہے تھے۔ دربار عیش کی آماج گاہ تھا۔ پیرس بے خبر تھا کہ کیا ہو رہا ہے؛ ملک کے ایک کونے میں مذہب کے زیر اثر یہ فعل عمل میں آیا کہ انصاف نے ایک غریب بوڑھے کو چکر پر رکھ کر مار ڈالا۔ غریب بچے کی زبان گانا گانے کے جرم میں کاٹ ڈالی گئی!!!

ایسی ہولناک اور بیوقوف سوسائٹی کے درمیان والٹیر کی واحد ہستی تھی جس نے ان خرابیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اس کے مقابلہ کے لئے دُنیا کی ساری طاقتیں موجود تھیں ——— دربار امراء اور دار السلطنت کی متحدہ قوتیں۔ اندھی مخلوق۔ ظالم انصاف جس کا کام صرف عوام کی گردن پر قدم رکھ کر بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنا تھا۔ کلیسا اپنی ساری بُرائیوں اور تعصب کے ساتھ ——— غرض اسے ساری طاقتوں سے جنگ کرنی تھی۔ اور آپ کو معلوم ہے اس کے پاس ان کے مقابلہ کے لئے کیا ہتھیار تھا؟ ——— وہ ہتھیار جس میں ہوا کی سی سُبکی، آندھی اور طوفان کی سی طاقتیں موجود ہیں ——— یعنی "قلم"۔

اسی ہتھیار سے اُس نے جنگ کی اور اسی ہتھیار سے فتح پائی۔ آیئے ہم لوگ اس مقدس کارنامہ کی یاد میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی گردنیں جھکالیں۔

والٹیئر کی فتح رہی۔ اس نے بہترین قسم کی جنگ چھیڑی تھی۔ ایسی جنگ جس میں ایک ہستی ایک ہجوم کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہ جنگ تھی واقعات اور خیالات کی، عقل اور تعصب کی، انصاف اور ظلم کی، ظالم اور مظلوم کی۔ والٹیئر کی طبیعت غازی کی گرمی اور عورت کی نرمی سے مل کر بنی تھی۔ وہ عظیم الشان دماغ اور نرم دل کا مالک تھا۔ اس نے پُرانے خیالات اور پُرانے اصُول پر فتح پائی اس نے ظالم امرا اور مجسٹریٹوں کو زیر کیا۔ اس نے کلیسا کو اپنے سامنے گردن جھکانے پر مجبور کیا۔ اس نے عوام کو خاک سے اُٹھا کر تخت پر بٹھا دیا۔ وہ فرانس کو مہذب ممالک کے دائرہ میں لایا۔ خیال کیجیئے تو حقیقی معنوں میں وہ کلاس اور لابیر کا تنہا ہمدرد تھا اس نے ساری دھمکیوں، تکلیفوں، نفرتوں اور جلاوطنی کا ہنسکر مقابلہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکست اس کے لئے بنی ہی نہیں اس نے تشدد کو تبسم سے شکست دی، ضد کو استقلال سے، اور جہالت کو حق سے!

ہا۔ میں نے لفظ "تبسم" استعمال کیا۔ مجھے کچھ دیر بولنے کا موقع دیجیئے۔ تبسم اور والٹیئر کا!!

حضرات! فلسفی کی طینت کا نمایاں رُخ کیا ہے؟ مصالحت۔ والٹیئر کی طبیعت ہمیشہ اس سے آشنا رہی۔ طوفاں گزر جانے کے بعد سمندر میں زیادہ سکون پیدا ہوجاتا ہے۔ غصہ کے بعد اس کی طبیعت ٹھنڈی ہوجاتی اور ان ٹیڑھے ٹیڑھے لبوں پر تبسم کی جھلک رونما ہونے لگتی۔ وہ تبسم مجسم عقل ہوتا۔ اور میں کہتا ہوں کہ وہ تبسم ہی اصلی والٹیئر ہے۔ تبسم بڑھ کر ہنسی ہوجاتی ہے لیکن اس کی فلسفیانہ طبیعت اسے اعتدال سے نہ گزرنے دیتی۔ تبسم کس چیز کا مظہر ہے؟ ــــ مضبوط کے لئے وہ طعن ہے اور کمزور کے لئے ہمدردی کی نشانی، وہ ظالم کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے اور مظلوم کی پیٹھ ٹھوکتا ہے، بڑے کے لئے وہ نفرت کا جذبہ پیش کرتا ہے اور چھوٹے کے لئے رحم۔ آیئے ہم لوگ بھی اس سے متاثر ہوں۔ اس میں صبح کی پہلی شعاع کی سی نرمی ہے۔ وہ حق، انصاف اور خوبی پر نیا ملمع کردیتا ہے۔ وہ روح کو ایک تازہ فرحت بخشتا ہے۔

والٹیئر کا تبسم صرف اس کے اندرونی جذبات کا آئینہ دار ہی نہ تھا بلکہ بہت ہی مفید بھی تھا۔ نئی سوسائٹی، برابری اور رعایت کی خواہشات، ملک میں برادرانہ تعلقات کی لہر، باہمی خوش اعتقادیاں، انسانی حقوق کی حفاظت، بے تعصبی، روحوں کی پاکیزگی، صلح ــــ آپ غور کرسکتے ہیں یہ سب اس مشہور عالم تبسم کی برکتیں ہیں جن سے ہم آج ایک صدی کے بعد بھی فیضیاب ہورہے ہیں۔

اس دن ــــ جو بہت جلد آنے والا ہے ــــ جب دُنیا میں عقل اور رحم کی سلطنت ہوگی، جب مجرم سزا کے بجائے معافی سے نادم کیا جائے گا ــــ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں اس دن آسمان پر والٹیئر کے لب اسی تبسم سے پھر آشنا ہونگے۔

حضرات! بنی آدم کے دو خادم جن کے ظہور میں اٹھارہ سو برس کا فاصلہ ہے ایک خاص رشتہ میں بندھے ہیں بُت پرستی کے

ہولناک دیو کو شکست دینا، فریب کا قلع قمع کرنا تعصب بد اعتقادی اور دیگر بُرائیوں سے دُنیا کو نجات دلاتا ظلم ستم اور جبر و تعدی سے دُنیا کو پاک کرنا، دُنیا میں حق کا تعارف، ظالم حکومت کی بیخ کنی، مذہب کے بے جا اقتدار کا خاتمہ، بنی آدم کے حقوق کی واپسی، غریب اور کمزور کی پُشت پناہی ——— یہ تھی وہ جنگ جو مسیح نے شروع کی تھی اور جس نے یہ مقدس جنگ پھر تازہ کی وہ والٹیر کی پاک ہستی تھی!!

بنی آدم کے ان دو خادموں میں یہ فرق تھا کہ "مسیح روئے" اور "والٹیر مسکرایا"۔ اسی "خدائی آنسو" اور "انسانی تبسم" سے مِل کر ہماری یہ نئی تہذیب بنی ہے!!

کیا والٹیر ہمیشہ مسکراتا ہی رہتا تھا؟ نہیں — وہ بعض اوقات خشم آلود بھی ہو جاتا۔ آخر وہ انسان تھا۔ حضرات! ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعتدال فلسفی کا خمیر ہے۔ ایک عقلمند ہمیشہ بُردباری اور حلم کو راہ دیتا ہے۔ لیکن انسانی طبیعت اپنی خاصیت چھوڑ نہیں سکتی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ طوفان گزر جانے کے بعد فضا میں سکون آ جاتا ہے۔

اگر منصفوں نے انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر مذہبی پیشواؤں نے عیاشی اور ہوسناکی کو راہ نہیں دی تو وہ تعریف کے مستحق ہیں اور اُن کی تعریف کی جائے گی۔ لیکن اگر انصاف کے معنی ظلم ہو جائیں اور اگر مذہب کے معنی جبر اور زبردستی کے لئے جائیں تو میں بھی اِن پر نفرین بھیجتا ہوں۔ ایسے وقت میں عوام اُٹھتے ہیں اور منصفوں کو جواب دیتے ہیں کہ قانون سے ہمیں کوئی کام نہیں۔ مذہبی پیشواؤں سے کہتے ہیں کہ ہم ان پُرانے ڈھکوسلوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں تمہاری دنیاوی آگ اور آسمانی عذاب سے کوئی غرض نہیں۔ اس وقت دُنیا کا خاموش "فلسفہ" سر اُٹھاتا ہے اور منصفوں کو انصاف کے سامنے اور مذہبی پیشواؤں کو خدا کے سامنے مجرم ٹھیراتا ہے۔

یہی کام ہے جو والٹیر نے درحقیقت کیا۔ کتنا عظیم الشان اور قابلِ یادگار کارنامہ ہے!

والٹیر کیا تھا؟ میں کہہ چکا۔ اب میں آپ کے سامنے اس کا عہد پیش کروں گا۔

حضرات! بڑے لوگ شاید ہی تنہا آتے ہیں۔ اونچے درخت گھنے جنگلوں میں بزرگ تر نظر آتے ہیں اسی طرح والٹیر کے اردگرد بھی دماغوں کا ایک عظیم الشان جنگل تھا اور یہ جنگل اٹھارھویں صدی ہے دماغوں کے اس جنگل میں دوسرے اُونچے اُونچے درخت بھی تھے (BEAUMARCHAIS ، MONTESQUIE ، BUFFON) روسو[1] اور ڈیڈرو[2] بزرگی میں والٹیر

[1] مشہور فرانسیسی مصنف (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸) اپنے خیالات کی وجہ سے فرانس چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اس کی تحریر نے "انقلاب فرانس" کے لئے راستہ صاف کیا۔ ڈیڈرو سے بڑی گہری دوستی تھی۔

[2] ایک فرانسیسی فلسفی (۱۷۱۳ - ۱۷۸۴) سائیکلوپیڈیا تیار کرنے میں آخری عمر کے تیس سال صرف کر دیئے۔

کے بعد ہی آتے ہیں۔ اِن فلسفیوں نے عوام کو سوچنے کا صحیح اُصول بتایا۔ آپ جانتے ہیں کہ فعل سے پہلے ارادہ ہمارے کاموں کو کامیاب بناتا ہے۔ دماغ کی صحیح رفتاری ہمارے افعال اور حرکات کو درست قائم رکھ سکتی ہے۔ ترقی کے ان حامیوں نے ملک کو سچا فائدہ پہنچایا۔ اٹھارھویں صدی کے ایک سطحی مطالعہ کے بعد ہم اس فیصلہ پر آسکتے ہیں کہ روسو نے عوام کی صحیح نمائندگی کی لیکن والٹیئر نسل انسانی کا نمائندہ ہے۔ وہ صاحبِ اقتدار اہلِ قلم دُنیا سے اُٹھ گئے لیکن ان کی روح "انقلاب" ہمارے لئے وقف ہے۔

ہاں "انقلاب فرانس" ان کی روح تھی۔ یہ ان کی ایجاد تھی۔ یہ ان کی تخلیق تھی۔ اس خطرناک کام میں جس نے ماضی کا خاتمہ کردیا اور جو "کتاب حال" کا نیا باب کھولتا ہے انہیں کی روح سرگرم کار نظر آتی ہے۔ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھتے ہوئے ڈیڈرو، روسو اور والٹیئر کی روحیں دوش بدوش ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

یہ انہیں کا کارنامہ ہے۔ قابلِ فخر کارنامہ — قابلِ ستائش کارنامہ

حضرات! تاریخ کے مختلف ادوار کو ہم لوگ ان ناموں سے یاد کرتے ہیں 'عہد آگسٹس'، 'عہد لوئی دہم'، 'عہد لوئی چہاردہم'۔ اسی طرح تاریخ کا ایک باب 'عہد والٹیئر' کے نام سے بھی پکارا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے ناموں نے تاریخ کی تقسیم میں بہت سہولیت پیدا کردی ہے۔ والٹیئر سے قبل یہ مختلف باب بادشاہوں کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے لیکن والٹیئر بادشاہوں سے بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ وہ ملک کا نہیں بلکہ خیالات کا بادشاہ ہے۔ اس نے ایک نئے دَور کا آغاز کیا ہے "تہذیب" پہلے "طاقت" کے زیر اثر تھی لیکن زمانہ بدل گیا اب اس پر "خیالات" کی حکومت ہے۔ تلوار اور شاہی عصا کے عوض دُنیا پر اب 'شعاع نور' کی حکومت ہے۔ یعنی "قوت" کی جگہ اب "آزادی" نے لے لی ہے۔ اب سوائے قانون عام اور آزادیٔ ضمیر کے دُنیا میں کوئی دوسری طاقت نہیں۔

ہمارے سامنے ترقی کے دو پہلو ہیں۔ اپنے حقوق کی حفاظت یعنی ایک "انسان" بننا اور اپنے فرض کی تکمیل یعنی "شہری" (Homo Civis) بننا —— عہد والٹیئر کا یہی مطلب ہے اور اس "مقدس وظیفے" "انقلاب فرانس" کے یہی معنی ہیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی نے اس کا سامان بہم پہنچایا۔ MOLIERE اور REBELAIS نے اپنی تصنیفوں میں حکومت اور کلیسا کو متنبہ کردیا۔ اقتدار سے نفرت اور حق کی حفاظت کو قدرت نے خون بنا کر ان کی رگوں میں ڈالا تھا۔

آج جو یہ کہتا ہے کہ طاقت ہی اصل چیز ہے اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے سے بہت زیادہ تہذیب یافتہ لوگوں سے گفتگو کررہا ہے۔ یہ تین صدی پیچھے کی گفتگو ہے۔

حضرات! انیسویں صدی نے اٹھارھویں صدی پر ایک نیا رنگ چڑھا دیا ہے۔ ہم اس بات کو اس طرح ادا کرسکتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی نے تحریک پیش کی اور اُنیسویں صدی نے اس کی تائید کی۔ ان دو جملوں میں ہم دو صدیوں کی ساری ترقیوں کا جوہر اور روح بیان کردیتے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ حق انسانی موالفت (Human Federation) کو اپنا ضابطہ بنالے۔

آج قوت کا استعمال تشدد کہلاتا ہے۔ کون اسے برداشت کرسکتا ہے؛ جنگ اس کا واحد انجام ہے۔ انسانی تمدن کی تلوار سے فاتحوں اور جرنیلوں کو پابزنجیر انصاف کے تخت کے سامنے لاکر سزا کا طالب ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہیرو کو اکثر دار کے منحوس تختے کی صورت دیکھنی پڑی ہے۔ عوام یہ سمجھ گئے کہ جرم کی عظمت 'جرم' کو ناپید نہیں کرسکتی۔ یعنی اگر قتل کرنا گناہ ہے تو قتل عام کوئی فائدہ مند چیز نہیں ہوسکتی۔ اگر چوری جرم ہے تو یورش قابلِ ستائش عمل نہیں ہوسکتی۔ مردم کشی ہمیشہ مردم کشی رہیگی۔ اور قتل ہمیشہ قتل۔ قیصر اور نپولین کا نام اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ قادرِ مطلق سب کچھ دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں ڈاکو کی ٹوپی کے عوض تاج دیکھ کر دھوکا نہیں کھاسکتیں۔

آیئے ہم لوگ حق کا نعرہ ماریں۔ جنگ قابلِ نفرت چیز ہے۔ "جنگ" اور "نفع" یہ دو متضاد الفاظ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ خون بہانا، مظلوموں کی تعداد میں اضافہ کرنا فائدہ مند ہوسکتا ہے؛ حاضرین آپ میں سے کتنے بھولے بھالے بچوں کے باپ ہوں گے کیا آپ پسند کریں گے کہ ڈاکو آپ کا بچہ لے جائے۔ یہ کبھی پسند نہیں کیا جاسکتا کہ مائیں تکلیفیں اٹھائیں اور بچے جنیں، لوگ محنت و مشقت سے کھیت جوت کر غلہ پیدا کریں، صناع شہروں کو خوبصورت بنائیں، ادب کے نادر نمونے پیدا کئے جائیں۔ ملک کا ادبی ذخیرہ تیار ہو اور یہ سب خدا کی خدائی میں، آفتاب اور ماہتاب کی روشن چھت کے نیچے جنگ کے ہولناک دیوتا کے پیٹ میں چلا جائے۔

اصل میدان جنگ یہ ہے۔ سب سے بڑی قربانی یہ ہے جو ملک نے بنی نوع انساں کے لئے والٹیر کی صورت میں پیش کی ہے۔

"زندہ باد والٹیر"

شمسی کاکوی

جب محبت دو ہستیوں کو اپنی گرمی سے پگھلا کر ایک مقدس قالب میں ڈھال دیتی ہے تو ان پر رازِ حیات عیاں ہوجاتا ہے۔ تب اُن کی ایک ہی قسمت ہوتی ہے۔ وہ اس وقت ایک رُوح کے دو بازو ہوتے ہیں ـــــ اے محبت بلندیوں میں پرواز کرتی رہ!

وکٹر ہیوگو

ایک گھرانا

پندرہ سال بعد آج پھر میں اپنے دوست سائمن راولیوں سے ملنے کے لئے جارہا تھا۔

کبھی وہ میرا بہترین دوست تھا ـــــ میرے دل کا حقیقی رازداں ـــــ ایسا دوست، جس کی صحبت میں آدمی خاموش یا مسرور رہ کر اکثر شام کا طویل وقت گذار سکے، جسے آدمی اپنے دل کے سربستہ رازوں سے آشنا کرسکے جس کو بلا تکلف اپنے نادر، لطیف، بلند اور پاکیزہ خیالات سے آگاہ کرسکے۔ ـــــ ایسے خیالات جن کی تخلیق باہمی ہمدردی کی پُرامن فضا میں ہُوئی ہو!

ایک طویل مدت تک ہم ایک دوسرے سے شاذ ہی جدا ہوئے ـــــ ہم دونوں اکٹھے رہتے، اکٹھے سفر کیا کرتے اکٹھے سوچتے، ایک ہی قسم کی آرزوؤں کی پرورش کرتے۔ ایک چیز کو ایک ہی طرح دیکھتے، ایک سی کتابوں کی تعریف کرتے ایک ہی طرح کے آرٹ کو پسند کرتے، ایک ہی طرح کے احساسات سے اثر پذیر ہوتے، اور ایک ہی طرح کی چیزوں کو دیکھ کر مسکرا اُٹھتے۔ غرض کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

ایک دن یکایک اس نے اپنے ہی صوبے کی ایک لڑکی سے شادی کرلی، جو شریکِ زندگی کی تلاش میں پیرس آئی تھی۔ نہ جانے اس سنہرے بالوں والی، نازک اندام، پست قامت، چابکدست لڑکی نے، جس کی آنکھوں سے بے وفائی جھلک رہی تھی، جس کی شریر آواز سے اس کے شوخ طبیعت ہونے کا پتہ چلتا تھا، اور جو دوسری ہزاروں شادی کے قابل لڑکیوں کی طرح تھی، اس ذی فہم اور شُستہ مزاج آدمی کو کیسے منتخب کرلیا۔ کوئی بھی اس بات کو نہ سمجھ سکا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والی اور باوفا بیوی کی آغوش میں حقیقی اور زندہ جاوید مسرت حاصل کرسکتا ہے۔ وہ تصور کیا کرتا تھا کہ وہ اس سنہرے بالوں والی چھوٹی سی لڑکی کی شفاف آنکھوں میں یہ سب کچھ دیکھ چکا ہے۔

اُسے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ ایک ہوشیار، بلند حوصلہ اور حساس آدمی جب ایک مجازی چیز کی المناک حقیقت تک پہنچ جائے تو وہ اس سے فوراً متنفر ہوجاتا ہے۔ اور حقیقت شناسی کا احساس اس میں اُس وقت تک مُردہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی قوتِ ادراک عام چیزوں کو سمجھنے سے قاصر نہ ہوجائے۔

میں کس قسم کے انسان سے ملنے جارہا ہوں؟ کیا وہ ابھی تک ویسا ہی زندہ دل، زیرک، ہنس مکھ، اور پُرجوش آدمی ہے یا ازدواجی زندگی نے اس کو بالکل مُردہ کردیا ہے۔ پندرہ سال میں آدمی بہت کچھ بدل سکتا ہے!

ٹرین ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھہری۔ جونہی میں گاڑی پر سے اُترا، ایک موٹا تازہ اور توانا آدمی میری طرف بازو پھیلائے اور "جارج جارج" کہتے بے تحاشا دوڑا۔ اس کے گال سُرخ تھے اور اس کی توند بڑھی ہوئی تھی۔ مَیں اس سے بغلگیر تو ہو گیا مگر اسے پہچان نہ سکا۔

میں نے پریشان ہو کر کہا "بخدا تم تو بہت موٹے ہو گئے!"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "اور تم کیا چاہتے تھے بھئی، اچھا رہنا سہنا، اچھا کھانا پینا، راتیں ہیں تو آرام کی، دِن ہیں تو آسائش کے۔ بس یہ ہے میری زندگی!"

میں نے اس کی طرف غور سے یوں دیکھا، گویا مَیں نے اس چوڑے چکلے چہرے سے کبھی محبت کی ہے۔ صرف آنکھیں ہی تھیں، جو ابھی تک نہ بدلی تھیں، مگر ان میں وہ پہلی سی روشنی نہ تھی۔ مَیں نے دل میں کہا "اگر یہ صحیح ہے کہ آنکھوں کی روشنی دماغ کا عکس ہوتی ہے تو یہ دماغ جو اس سر میں ہے، وہ نہیں جسے کبھی مَیں اچھی طرح آشنا تھا۔

یُوں تو اس کی آنکھیں جوشِ مسرت اور دوستانہ گرمجوشی سے چمک رہی تھیں مگر ان میں فہم و فراست کا وہ نور باقی نہ تھا جس سے کسی شخص کی قابلیت کا پتہ اسی طرح چل جاتا ہے جس طرح گفتگو سے اس کی ذہنی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔

سائمن یکایک بولا "دیکھو یہ میرے دو بڑے بچے ہیں!"

چودہ سال کی ایک لڑکی، جو بالکل جوان معلوم ہوتی تھی، اور تیرہ سال کا ایک لڑکا، سکول کے لباس میں، ذرا ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا۔

میں نے آہستگی سے کہا "تمہارے؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "ہاں، ہاں"۔

"کتنے بچے ہیں؟"

"پانچ۔ تین گھر پر ہیں"۔

یہ جوابات اس نے اس درجہ فخر، خوشی، اور فاتحانہ انداز میں دیئے کہ میرا دل اِس بہائم صفت، انجان، سادہ لوح آدمی کے بے جا فخر پر انتہائی جذبۂ رحم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جو اپنی تمام راتیں، ایک دیہاتی مکان میں رہ کر، بھٹ میں رہنے والے خرگوش کی طرح، بچے پیدا کرنے کے لئے وقف کر چکا تھا۔

مَیں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے وہ خود ہی چلا رہا تھا۔ ہم شہر کے ایک بے رونق اور سنسان حصے میں سے گذر رہے تھے۔ گلیوں میں سوائے چند کُتّوں اور دو تین خادموں کے اور کوئی فرد نظر نہ آتا تھا۔ گاہے گاہے کوئی دکاندار دروازے میں بیٹھا اپنی

ہیٹ کو جنبش دیتا اور سائمن سلام کا جواب دیتے ہوئے میرا تعارف اس سے کرا دیتا ۔ وہ مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں یہاں کے تمام لوگوں سے واقف ہوں ۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ ڈپٹی بننے کے خواب دیکھ رہا ہے ——— ایسے خوشگوار خواب جو چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندے اکثر دیکھا کرتے ہیں ——— !

ہم جلد ہی اس جگہ سے گزر گئے ۔ گاڑی ایک عظیم الشان پارک نما ، باغ میں داخل ہوئی اور ایک بُرجیوں والے مکان کے سامنے آ رُکی ۔ یہ مکان خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا ۔

سائمن بڑے فخر سے کہنے لگا " یہ ہے میرا چھوٹا سا غریب خانہ "!

میں نے جواب دیا " یہ تو بڑا خوبصورت ہے "۔

سامنے کی سیڑھیوں پر سے ایک عورت نمودار ہوئی ۔ وہ ملاقات کا لباس پہنے ہوئے تھی ۔ اس نے اپنے بال بھی بڑے اہتمام سے اسی خاص موقع کے لئے بنا رکھے تھے اور اس کی پُرتپاک گفتگو میں بھی خاص ملاقاتی رنگ نظر آتا تھا ۔ پندرہ سال پہلے جب میں نے اسے گرجا میں دیکھا تھا ، اس کے بال اور اس کا چہرہ نہایت خوبصورت تھا ۔ مگر اب وہ ایک تنومند عورت معلوم ہوتی تھی اس کا لباس حد سے زیادہ نمائشی تھا ۔ اس میں وہ تمام خوبیاں ——— پختگی ، استقلال ، حُسن ، فراست ، مفقود تھیں جو صنف لطیف میں عموماً پائی جاتی ہیں ۔ وہ صرف ایک ماں تھی ماں ——— ایک موٹی سی عام ماں ——— جس کا بچے پیدا کرنے اور کھانا پکانے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ ہو !

اس نے میرا استقبال کیا ۔ میں ہال میں داخل ہوا ، جہاں تین بچے قد کی ترتیب سے ایک قطار میں کھڑے تھے ۔ وہ ان فوجی سپاہیوں کی طرح استادہ نظر آ رہے تھے ، جو کسی میجر کے سامنے کھڑے ہوں ۔

میں نے کہا " خوب ۔ تو یہ ہیں باقی بچے ! "

سائمن نے نہایت مسرت سے مجھے ان کے نام بتائے ——— جین ، سوفی ، گنتراں ——— !

نشست گاہ کا دروازہ کھلا ۔ میں اندر داخل ہوا ۔ وہاں میں نے بازوؤں والی کرسی پر ایک لاغر ، نحیف ، بوڑھا دیکھا جو بیٹھے بیٹھے کانپ رہا تھا ۔

مادام راولیں آگے بڑھی اور بولی " یہ میرے نانا ہیں ۔ یہ ستاسی سال کے ہونگے "۔

اس نے بوڑھے آدمی کے کان میں زور سے کہا " نانا جان ، یہ سائمن کے دوست ہیں "۔

بوڑھا میرا خیر مقدم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا بھاری آواز میں بولا " واہ وا ۔ واہ وا " اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا " آپ نے قدم رنجہ فرمایا ، آپ کی نوازش "!

مَیں جواب دے کر چپکے سے کُرسی پر بیٹھ گیا۔
اِتنے میں سائمن بھی آ گیا۔ وہ کہنے لگا "خوب، تو تمہارا نانا جان سے تعارف ہو گیا۔ یہ تو برکت کا ایک گراں مایہ خزانہ ہیں، بچوں کا دل ہر وقت ان سے بہلا رہتا ہے۔ یہ کھانے کے اتنے شوقین ہیں کہ کھانے کی ہر چیز پر مر ہی مٹتے ہیں۔ اگر انہیں اجازت دے دی جائے تو شاید یہ دیگیں چٹ کر جائیں۔ تم ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے میٹھی چیزوں کو تو اتنی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں۔ تم نے کبھی ان سے زیادہ دلچسپ آدمی نہ دیکھا ہوگا۔ تم ابھی سب کچھ دیکھ لوگے۔"
مجھے نہانے اور لباس تبدیل کرنے کا کمرہ بتایا گیا۔ یہ کھانے کا وقت تھا۔ سیڑھیوں پر سے قدموں کی بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ مَیں نے مُڑ کر دیکھا۔ تمام بچے جلوس کی شکل میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، شاید میری عزت افزائی کے لئے۔
میرے کمرے میں سے گیہوں، جئی اور گھاس کا ایک وسیع و عریض سنسان میدان نظر آ رہا تھا، جس میں نہ کوئی درخت تھا نہ ٹیلا۔ یہ زندگی کا نہایت ہی وحشت انگیز نمونہ تھا جو اس سکوت پرور میدان کے پاس اس گھر میں نظر آ رہا تھا۔
کھانے کی گھنٹی بجی، میں نیچے آ گیا۔
مادام راڈیوں نے میرا بازو پُر تکلف انداز میں پکڑا اور ہم دونوں کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک خادم بوڑھے کی بازوؤں والی کرسی دھکیلتے ہوئے آ رہا تھا۔ جونہی اس کی کرسی میز کے قریب پہنچی، بوڑھے نے، کانپتے ہوئے بڑی مشکل سے گردن موڑ کر ایک للچائی ہوئی مُستفسرانہ نگاہ حلوے کی ایک پلیٹ سے دوسری پلیٹ پر ڈالی۔
معاً سائمن نہایت خوشی سے تالی بجاتے ہوئے بولا "ــــ ان کی مضحکہ خیز حرکتیں دیکھ کر ابھی تم بہت خوش ہوگے"۔ جب بچوں نے یہ دیکھا کہ میں بھی حریص بوڑھے کی حرکتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان کے ساتھ شامل ہوں تو وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ان کی ماں کے ہونٹوں پر بھی تبسم نمودار ہو گیا۔
سائمن نے اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بوڑھے سے چلا کر کہا "آج شام تو میٹھے باسی چاول بھی موجود ہیں"۔
بوڑھے کا شکن آلود چہرہ تمتما اُٹھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک زور زور سے جنبش کرنے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سائمن کا مطلب سمجھ چکا ہے اور خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔
کھانا شروع ہو گیا۔
سائمن نے کہا "دیکھنا ذرا اِدھر"۔
بوڑھا شوربا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ مگر صحت کی خاطر اسے شوربا پینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ خادم نے زبردستی اس کے مُنہ میں چمچہ بھر شوربا ٹھونس ہی دیا۔ اس نے اسے زور سے باہر اُگل دیا۔ تمام شوربا فوارے کی طرح اس کے مُنہ

سے پھوٹ نکلا۔ اور اس کی چھینٹیں ہم سب پر اور میز پر جا پڑیں۔

بچوں کی ہنستے ہنستے چیخیں نکل رہی تھیں۔ ان کا باپ بھی بے حد خوش ہؤا اور کہنے لگا "نانا جان کتنے دلچسپ ہیں۔ ہیں نا؟"

کھانے کے دوران میں نانا جان ہی پر سارے کُنبے کی توجہ رہی۔ بڈھے کی نظریں میز کی پلیٹوں پر اس طرح جمی تھیں، جیسے وہ ابھی ان سب کو نگل جائے گا اور اس کے زور زور سے کانپتے ہوئے ہاتھ انہیں اُچک لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی وہ اس کے بالکل قریب ہی رکھ دی جاتی تھیں۔ تاکہ تمام اس کی جاں توڑ کوشش، اس کی ضعیف گرفت اور اس کی صبر آزما خواہش سے جو اس کے روئیں روئیں سے ٹپک رہی تھی لطف اُٹھائیں اور اس کی حریص آنکھوں، اس کے حریص منہ اور اس کی حریص ناک کا جو انہیں سونگھ رہی تھی، تماشا دیکھیں۔ اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور جب وہ بے معنی لفظ مُنہ سے نکالتا تھا تو سارا پانی تولیے پر گر پڑتا تھا۔ تمام کُنبہ اس مضحکہ انگیز کریہہ منظر کو دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

وہ اس کی پلیٹ میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیتے، اور وہ دوسرے کی امید میں اسے کانپتے ہوئے جلدی سے کھا جاتا۔

جب میٹھے چاول آئے تو وہ بالکل دیوانہ سا ہو گیا۔ اور فرطِ اشتیاق سے کراہنے لگا۔

گنتراں نے بلند آواز سے کہا "آپ بہت کچھ کھا چکے ہیں۔ اب آپ کو کچھ نہیں مل سکتا"۔

یہ سُن کر بوڑھا پھر چلّانے لگا۔ چلّاتے وقت وہ زور سے کانپنے لگتا۔ تمام بچوں نے ہنس ہنس کر اُودھم مچا رکھا تھا۔

آخر کار اس کا حصّہ، جو بہت تھوڑا سا تھا، اسے دے دیا گیا۔ جونہی اس نے چاولوں کا ایک لقمہ مُنہ میں ڈالا۔ اس نے حلق سے بلا نوشوں کی طرح ایک نہایت دلچسپ آواز نکالی۔ اس کی گردن یوں حرکت کر رہی تھی جس طرح بطخ بڑا سا لقمہ نگلتے وقت گردن کو جلدی سے اوپر نیچے کرتی ہے۔

جب اس نے وہ کھا لیا تو اور مانگنے کے لئے زمین پر پاؤں مارنے لگا۔

بُڑھے کی دردانگیز حالت کو دیکھ کر میرا دل رحم سے بھر گیا اور میں نے اپنے دوست سے اسی کا واسطہ دے کر کہا "انہیں تھوڑے سے چاول اور دے دو"۔

سائمن نے جواب دیا "نہیں نہیں۔ اگر یہ اُس عمر میں زیادہ کھا لیں گے، تو ان کی صحت خراب ہو جائے گی"۔

میں چُپ چاپ بیٹھا غور کرتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس عُمر میں، اس کے لئے صرف ایک ہی خوشی باقی ہے اور صحت کا بہانہ کر کے اُنہوں نے وہ بھی چھین لی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ صحت! پوست و استخواں کے اس پنجر کو صحت کی اب کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ لوگ اس کی زندگی کے دنوں کو بڑھانے کی فکر میں ہیں؛ ہاں اس کی زندگی کو! آخر اسے کتنے دن جینا ہے؛ دس، بیس، پچاس یا سو دن! یہ کیوں؛ کیا اپنی ذات کی خاطر؛ یا اپنی ناکام حرص کے مظاہرے سے دوسروں کے پیہم لطف اندوز ہوتے رہنے

کے لئے؛ اسے دراصل اس زندگی سے اب کوئی سروکار نہیں ——— اس کے دل میں اب صرف ایک ہی تمنا، ایک ہی خوشی باقی رہ گئی ہے، تو کیوں نہ اسے پوری طرح اس آخری خواہش کی تکمیل سے حظ اٹھانے کا موقع دیا جائے، یہاں تک کہ موت اس کا رشتۂ حیات منقطع کردے!

دیر تک تاش کھیلنے کے بعد، میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔ میں اس وقت بے حد غمگین ہو رہا تھا۔

میں کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ باہر ہُو کا عالم تھا۔ صرف پاس کے درخت پر بیٹھے ہوئے ایک پرندکی کمزور، صاف اور شیریں چُوں چُوں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ شاید یہ ایک دلکش لوری تھی، جو وہ رات بھر انڈوں پر بیٹھا، اپنے ساتھی کو سُنا رہا تھا۔

میں اپنے دُنیادار دوست کے پانچ بچّوں کے متعلق سوچتا رہا، جو اس وقت غالباً اپنی بدصورت بیوی کے پہلو میں خرّاٹے لے رہا تھا۔

(موپساں) ——— طاہر قریشی

خدا دو محبت کرنے والے دلوں کی مسرت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ وہ اُن کو دوام بخش دے محبت کی زندگی کے بعد، محبت کا دوام یقیناً ایک اضافہ ہے لیکن محبت کی اُس شدت میں کسی ناقابلِ بیان لذت کا اضافہ جو محبت روح کو عطا کر چکتی ہے، خدا کے لئے بھی ناممکن ہے، خدا معموری ہے کائنات کی اور محبت معموری ہے انسان کی۔

عاشق و معشوق تکلیفِ جدائی کو ہزاروں طریقوں سے فریب دیتے ہیں۔ یوں بظاہر وہ نہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں نہ پیغام بھیج سکتے ہیں۔ لیکن خط و کتابت کے لئے وہ بے شمار مخفی ذرائع رکھتے ہیں۔ وہ حکم دیتے ہیں پرندوں کے نغموں کو، پھولوں کی نکہت کو، بچوں کی ہنسی کو، سُورج کی روشنی کو، ہوا کی آہوں کو، ستاروں کی شعاعوں کو، تمام کائنات کو، اور کیوں نہ حکم دیں؛ ——— خدا نے ساری کائنات محبت ہی کی خدمت کے لئے پیدا کی ہے۔ محبت میں اتنی قدرت ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے کو اپنے حکم کی تعمیل پر آمادہ کر سکتی ہے۔

اے بہار! تو ایک خط ہے جو میں اُسے لکھتا ہوں
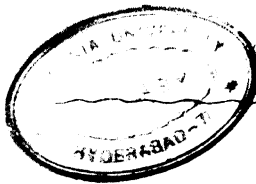
وکٹر ہیوگو

فرانسیسی شاعری اور رومانوی تحریک

انقلاب فرانس ایک بم تھا جس کی تیاری میں ہر آزاد مفکر و ادیب نے ہاتھ بٹایا لیکن جب یہ پھٹا تو اپنے ساتھ اپنے بنانے والوں کو بھی لے اُڑا۔

دھواں غائب ہؤا تو معلوم ہؤا کہ قدیم عہدِ حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے لوگوں کے دل ایک عظیم الشان ردِعمل سے دوچار ہو رہے ہیں اور آخری دو صدیوں کی روایات کو نہایت شدت سے تباہ و برباد کر دیا گیا ہے! یوں معلوم ہوتا تھا کہ ادب کی بنیاد از سرِ نو ڈالی جائے گی۔

اگر آپ ذرا غور سے فرانسیسی ادب کا مطالعہ کریں تو آپ کو دو جذبے کارفرما نظر آئیں گے یا یوں کہئے کہ دو نہریں اس چمنستان کو سیراب کرتی نظر آئیں گی، جن کے طفیل فرانسیسی زبان شاہکاروں سے مملو ہے۔ ایک طرف تو ان تھک شوقِ جستجو ہے جس کی وجہ سے فرانسیسی نثر مخصوص امتیاز لئے ہوئے ہے اور یہ اس قوم کی قوتِ تنقید پر دال ہے۔ اسی نے "حقیقت پسندی" کی تخلیق کی (عریاں حقیقت کو صاف الفاظ میں صحت کے ساتھ بیان کر دینے کا نام حقیقت پسندی ہے)۔ دوسری طرف پہلے سے قطعی متضاد وہ جذبہ ہے جسے آپ "لسانیت" کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس زبان کی جھلک جو نہایت خوش مذاقی سے مرتب کی گئی ہو آپ کو Rabelais رے بے لے کے طوفانی فقرات میں Bosseut باسوئے کی پر شوکت تحریرات میں اور کارنیہ کی Tirades میں نظر آئے گی!

سترھویں صدی کے استادانِ زبان پاسکال Pascal راسین Racine. لافونٹن La Fountaine اور La-Bruyere لابرویر نے ان دونوں جذبات کو متحد کر کے زبان کو اک مکمل توازن بخش دیا۔ انہوں نے اپنی تصنیفات میں ٹھوس حقیقتوں کو حسین و جمیل زبان سے مرصع کر دیا ہے اور تنقیدی نظر کو کام میں لا کر مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا ہے۔

جب اٹھارھویں صدی کا آغاز ہؤا تو زبان کی دُنیا میں ایک تغیر رونما ہؤا۔ لسانیت کو بڑی حد تک خیرباد کہہ دی گئی تھی۔ اس، لئے اب آپ پائیں تو اسے خشک اور بے روح نثر میں زندگی کے آخری سانس لیتے ہوئے پائیں گے یا کسی المیہ داستانِ عشق میں۔ والٹیر کا اسلوب بیان اپنے عہد کی خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ درخشاں مگر بے رنگ، محدود مگر نہایت معقول۔ رومانوی تحریک حقیقت پسندی کے خلاف پُر زور طور پر صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ تحریک نو کا دھندلا سا اثر دی درو Diderot کی شوخ رنگ تحریرات میں

اور روسو Rousseau کے خطابی انداز میں صاف صاف جھلک رہا تھا۔ شیتوبری آں Cheteau briand کی نثر نہایت بلند آہنگی سے رومانوی تحریک کا اعلان کر رہی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ بھی بدل لسانیت کا خواہاں تھا مگر اس نے اس لفظ کے معانی کو بہت وسعت دے رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل کی ساخت ہی لسانیت پسند تھی۔ اس کی تحریر کے وہ تین مقاصد جنہوں نے اسے زبان کے بہترین نمونے پیش کرنے کی توفیق دی اس کی اپنی ذات، فطرت اور عیسائیت تھی۔ عیسائیت کے متعلق اس کا نظریہ اٹھارھویں صدی کے نظریے کا بالکل عکس تھا۔ جو مذہبی عقاید محض خشک، مدلل اور نرے مذہبی عقاید ہی بن کر رہ گئے تھے اس نے انہیں اپنے زورِ تخیل اور شاعری کی رنگینی سے زندہ کر دیا تھا۔ لیکن اسے والٹیر سے زیادہ مذہبی سمجھنا غلطی ہے۔ جن نظریات کا نتیجہ والٹیر نے اپنے دلائل و براہین کی خشک روشنی میں دیکھا تھا شیتوبری آں نے انہیں اپنی زبان دانی اور قادر الکلامی میں ملبوس کر کے زیادہ جاذبِ نگاہ بنا دیا تھا۔ اس میں ایک بات کی کسر تھی۔ محرومیٔ یقین!۔ اسے خود ستائی کا بہت شوق تھا۔ بائرن کی طرح اسے اپنی ذات پر بہت حسنِ ظن تھا۔ بلند مرتبت، متین، مغرور، حساس۔ چاہتا تھا کہ ہر عورت اس کی پرستش کرے اور ہر مرد اُسے سراہے! پر شوکت مگر غیر حقیقی۔ نہایت نفیس مگر خالی۔ اور یہ سب زباں دانی اور لسانیت کی کرامت ہے! لیکن اس سے انکار نہیں کہ اس کا اثر بہت وسیع ہے۔ اس کی درخشاں دُنیا جہاں وہ حکومت کرتا ہے اس کی تحریرات کی طرح پُر شوکت۔ رواں دواں۔ رومانوی اور تخیل انگیز ہے! نظارہائے فطرت اور مقدس و لعبید ماضی اس کے ذہنی افکار پر ہر وقت چھائے رہتے ہیں۔ اس کی تصنیفات نے مقبولیتِ عامہ حاصل کر لی اور کوئی ایک صدی بعد اُن کا اثر محسوس کیا جانے لگا! اس کے نظریات کو لے مرٹین Lamertine نے اپنی نظموں کے ذریعہ سے کافی حد تک تقویت دی ہے! یہاں بھی وہی دلبستگیٔ قدرت، مذہبی تصور، اور اہمیت ذات پر زور دیا گیا ہے۔ مگر ان میں شیتوبری آں کی سی رعنائی کہاں؟ زور ہے تو گھٹا گھٹا اور کیف ہے تو کم کم! ہاں شگفتگی شعریت اور سوز و گداز نے مرٹین کو فرانسیسی ادب میں حیاتِ جاوید دے دی ہے! اس کے جذبات کی انتہا Lae Le نامی نظم میں بدرجہ اتم موجود ہے! اس کی قوتِ بیان نہایت جوش و خروش سے اس کے جذباتِ عمیق کو صفحۂ قرطاس پر قلمبند کرتی ہے "کبھی وہ اسی جھیل کے کنارے اپنی محبوبہ کی معیت میں آیا تھا۔ مگر آج تنہا اُداس بیچارہ اسی جھیل پر آوارہ ہے" غیر مختتم روانی سرود اس کی ہر نظم میں موجود ہے۔ ہمیشہ نقائص سے مبرا شگفتہ اور سُلجھی ہوئی۔

انقلاب کے دوران میں اور نپولین کے زوال کے بعد قوم کی تمام تر قوتیں ایک عرصہ کے لئے جنگ اور سیاست کے مسائل کے حل میں مصروف تھیں۔ بپایانِ کار ۱۸۳۰ میں چند نئے ادیبوں کی کوششیں جلوہ گر ہوئیں۔ ان نوجوانوں نے ثابت کر دکھایا کہ فرانسیسی زبان میں ابھی وہ جوہر باقی ہے جو سخت سے سخت اور ٹھوس سے ٹھوس خیال کو بھی نفاست اور لطافت سے رقم کر سکتا ہے یہ تمام نوجوان رشتۂ ادب کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ نوجوان تھے۔ رگوں میں جوانی کا خون لہریں لے رہا

تھا، سرگرم عمل تھے۔ ممکنات مستقبل سے ان کی آنکھیں روشن تھیں۔ فوراً قدیم روایتی ادب کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ ایک نئے نظریۂ خیال سے اپنی ہمتوں کی جولانی کا تعارف کرایا اور سخت جدوجہد اور جوش وخروش کے بعد اپنے نظریے کا لوہا منوالیا۔ جس تغیر سے انہوں نے اپنے عہد کو روشناس کرایا تھا وہ بذاتِ خود بہت اہم تھا اور اسی وجہ سے ۱۸۳۰ کا سال فرانسیسی ادب میں ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک فرانسیسی زبان کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک مصرع رومانوی تحریک کی ممنونیت کا نقش لئے ہوئے ہے۔ رومانوی تحریک سے قبل الفاظ پر پُرتکلف اور مصنوعی غلاف چڑھا رہتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ روایتی ادب کا جُوا ایک ایک گردن پر نظر آرہا تھا۔ علمبردارانِ تحریک نے گویا نئی بوتلوں میں شراب کہنہ کو ذرا خوشگوار کرکے بھردیا تھا۔ عمارتِ قدیم کے ناگوار اثرات کو ضائع کرکے نئے اور گوارا اثرات نمایاں کردیئے تھے۔ اس تحریک کے فدا کاروں نے ثابت کردیا کہ اصول کی پابندی کے بغیر بھی "اچھی نظم" کہی جاسکتی ہے۔ خزینۂ الفاظ پر بھی اچھا خاصا اثر پڑا۔ پہلے شاعری کے مخصوص الفاظ کے علاوہ اور لفظ استعمال کرنا گویا گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنا تھا۔ "بلند" اور "حقیر" لفظ کی تخصیص پر شدت سے بحث ہوتی تھی۔ اور کسی کی کیا مجال جو "حقیر" لفظ کو اپنی شاعری میں اذنِ باریابی دے! اس سے شاعری کا حلقۂ اثر بہت تنگ ہوگیا تھا اور کان بار بار انہی الفاظ کے اعادہ سے گرانی محسوس کرتے تھے۔ اس تحریک کے ہواخواہوں کا بھلا ہو کہ انہوں نے شاعری کے دروازے ہر موزوں ومعقول لفظ پر چوپٹ کھول دیئے۔ انہیں بہت شدید اور تند رائے عامہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ تغیر اور اس کی فتحمندی کتنی دشوار تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ ایک دفعہ ۱۸۳۰ کے کچھ پہلے۔ اوتھیلو کا ڈرامہ سٹیج ہو رہا تھا۔ اور اس میں ایک لفظ Mouchoir موشوار (رومال) کے استعمال نے تھیئٹر ہال میں بلوہ پیدا کردیا۔ تحریک رومانوی کی ہمت سے الفاظ کا جو جمِ غفیر شاعری کی دُنیا میں گھس آیا تھا اس کے دو اثر قابلِ غور ہیں شاعری کا عرصۂ خیال غیر محدود طور پر وسیع ہوگیا۔ فرانسیسی ادب ایک پُرانے سجے سجائے قیانوسی حجلے سے نکل کر کھُلی دنیا اور تازہ ہوا میں سانس لینے لگا۔ جو جذبات ابھی تک اچھوت تھے۔ تحریروں میں شدومد کے ساتھ ظاہر ہونے لگے۔ فرانسیسی نثر جو ابھی تک مکمل طور پر انسانیت کے زیرِ اثر تھی لیکن جس میں حقیقت پسندی کے جوہر ضرور نہاں تھے۔ رومانوی تحریک پسندوں کا ساتھ دینے لگی۔ یہ مسئلہ اب ایک تنازع کی صورت اختیار کرگیا۔ اور تھیئٹروں کو اس نے اپنی جولاں گاہ بنایا۔ مگر ڈراموی کامرانی اس تحریک کے لئے کچھ قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ وکٹر ہیوگو کے Hernani نامی ڈرامے میں صحیح زندگی کے جذبات نہیں ہیں۔ تکلف اور تصنع کا زور کافی عیاں ہے۔ کہنے کو تو وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ ڈراما شیکسپیئر سے متاثر ہوکر لکھا ہے لیکن حقیقت میں اس پر والٹیئر کی ذہنیت چھائی ہوئی ہے۔ ڈرامے کی ساری فضا جانی بوجھی انسانیت سے معمور ہے۔ رومانوی تحریک کی بدترین صفات وکٹر ہیوگو کے اس ڈرامے میں عیاں کی گئی ہیں۔ وہ واقعی الفاظ کا بادشاہ تھا۔ جرئے الفاظ ضیائے آفتاب کی طرح اس کے دل ودماغ سے بہ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فنی نقطۂ نگاہ سے وہ عظیم الشان ہے۔ تاثیر کا جادو ایک ایک صفحہ میں

کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ وہ کونسا اعجاز ہے جو وکٹر ہیوگو کے زورِ قلم سے علیحدگی اختیار کر سکے ۔ وہ تخیلات کے عجیب ترین نقوش آنِ واحد میں کھینچ سکتا ہے ۔ ماضی کے رازہائے سربستہ کو اشاروں میں سامنے لا سکتا ہے ۔ محبت کی راگنیاں، کرب اور راحت کے جذبات سے بھرپور اُس کے سحر کلام کی محتاج ہیں ۔ قدرت کے شیریں ترین راگ الاپ سکتا ہے ۔ انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ جانا اس کا ادنیٰ کام ہے ۔ اس کا جادو نگار قلم وہ بحرِ بے پایاں ہے جو ایک زور اور بے پناہ طاقت کے ساتھ آگے کو بڑھتا چلا آتا ہے ۔

Vigney ون یے اگرچہ کثیر التحریر تو نہیں تھا مگر جو کچھ لکھتا ہے خوب لکھتا ہے ۔ اور بعض تحریرات تو شاہکار کہلانے کی حقدار ہیں ۔ وہ پُرخلوص ۔ متین اور مفکر تھا ۔ اس کی متانت اور قنوطیت میں زندگی کی رمق ضرور باقی ہے ۔ اُس کی بعض نظمیں تغافل آشنا فطرت ستم ظریفِ قسمت اور مسموم محبت کی شکوہ طراز ہیں ۔ لیکن آخر کار درسِ تسلیم و رضا کا مبلغ بن کر ایک قابلِ فخر توکل پر اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے ۔ ایک معمر گیدڑ کو شکاریوں نے گھیر لیا اور غریب کا خاتمہ کر دیا ۔ اتنا سا واقعہ شاید اُس کے بلند ترین اشعار کی تخلیق کا باعث ہوا ۔ "مصیبت جھیلو ۔ مر جاؤ مگر خاموشی سے" ۔ انہی اشعار کا خاتمہ ہے ۔ اس کی نثر بھی نہایت زوردار ہے، ایک منفرد اندازِ نگارش کی سرمایہ دار ۔

Alfred de Musset الفرید دیموسے ون یے کے برعکس ہے ۔ عاشق مزاج، تندخو، شہوانی، موہنا، بدقسمت اور حزین ! اس کی شاعری کیا ہے اپنی ہی زندگی کے واقعات کی داستان !

صرف Fortunio فورتونیو والاگیت ہی اس کو اُستادانِ زبان کی صف اول میں کھڑا کر سکتا ہے ۔ اس کی نظر انسانی فطرت کے مطالعہ میں کافی کامیاب ہے ! اور تاریخی پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے ڈراموں کو زندہ جاوید کر دیا ہے ! ——

اس کی تحریک کافی کامیاب ہوئی اور یہ محض اس کی برکت تھی کہ فرانسیسی شاعری ایک طرح از سرِ نو تخلیق ہوئی اور نثر کی دنیا میں بھی انقلاب آگیا ! "بڑھے چلو اور تغیر و تبدل کئے جاؤ" ۔ یہ تھا وہ سبق جو اس تحریک کا راہبر تھا ! کوئی ۱۸۵۰ء کے قریب اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا !

اگر آپ اِن چند سطور کو بامعانِ نظر ملاحظہ فرمائیں تو کیا آپ اُردو کے موجودہ دور میں اور اس تحریک میں کچھ تطابق محسوس نہ فرمائیں گے ؟

(ترجمہ) ——— دوست محمد خان

حسین حاسدہ

شہنشاہ نپولین کی مصری یلغار کے زمانے میں ایک فرانسیسی سپاہی عربی بردہ فروشوں کے ہاتھ آگیا اور دریائے نیل کے پار تپتے ہوئے ریگستان میں پہنچا دیا گیا۔ بردہ فروش مسلح ہو کر حملہ کیا کرتے تھے اور صرف رات کو ڈیرے ڈالتے تھے۔ ان کا مسکن ایک کھجور کے پیڑوں میں گھرا ہوا کنواں تھا جہاں انہوں نے رسد کا سامان پہلے سے بہم پہنچا رکھا تھا۔ ان کے دماغ میں یہ خیال تک بھی نہ آیا تھا کہ ان کا قیدی کبھی بھاگ سکے گا لہٰذا انہوں نے صرف اس کے ہاتھ پیر باندھنے پر قناعت کی اور خود کھانا کھا کر اور گھوڑوں کو چارا ڈال کر سو گئے۔

جب بہادر قیدی نے اپنے دشمنوں کو بے خبر پایا تو اس نے اپنے دانتوں سے ایک خنجر اُٹھایا اور گھٹنوں میں دبا کر ہاتھوں کے تسمے کاٹ دیئے، آزادی کی سانس لینے کے بعد اُس نے فوراً ایک بندوق مع گولی بارود کے لی اور کچھ خور و نوش کا سامان لے کر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اُس طرف چل پڑا جدھر اُس کو خیال تھا کہ فرانسیسی فوج کا ڈیرا ہوگا۔ اُس کو پھر ایک مرتبہ فوجی ہنگامہ دیکھنے کے لئے اس قدر بے تابی تھی کہ اس نے تھکے ہوئے گھوڑے کو اتنا تیز کیا کہ مہمیز کی رگڑ سے اُس کی پسلیاں چھل گئیں۔ گھوڑا دفعتہً بیہوش ہو کر گرا اور مر گیا۔ سپاہی جوش آزادی میں تنہا اور پا پیادہ روانہ ہو گیا لیکن اس کو شام ہو جانے کی وجہ سے مجبوراً رُک جانا پڑا۔ مشرقی آسمان کی جھلملاہٹ اور صفائی کے باوجود وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اُس میں آگے جانے کی قوت باقی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اس کو ایک پہاڑی نظر آئی جس پر کچھ کھجور کے درخت اُگے ہوئے معلوم ہوتے تھے یہ دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی۔ اس کی تھکن اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ہر قسم کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر وہ پتھریلی چٹان پر لیٹ گیا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی قربانی کر رہا تھا۔ اس کے دِل میں صرف ایک خیال تھا اور وہ یہ کہ اس نے ناحق بردہ فروشوں کو چھوڑا جن کی خانہ بدوش زندگی اب اس کے حال پر مسکراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہ اُن سے بہت دُور بے کسی کے عالم میں تھا۔ مگر پھر وہ بے خبر ہو کر سو گیا۔

اس کی آنکھ سُورج کی تپش سے کھلی کیونکہ وہ غلطی سے اس طرف لیٹا تھا جدھر کھجور کے دراز قد درختوں کا سایہ صبح کو نہ پڑتا تھا۔ اُس نے اِن درختوں کو دیکھا اور اُن کی شاخوں سے بنے ہوئے تیروں کا خیال آتے ہی اس کو پھریری آگئی۔

اُس نے درختوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اس نے دیکھا کہ تاحدِ نظر ریگستان ہی

ریگستان ہے جس کے ذرّے سُورج کی تپش سے بے شمار آئینوں کی طرح جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اور آسمان پر سُورج کی روشنی سے ایک غبار آلود سفیدی آگ کے مسلسل شعلے کی صُورت میں دہک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان دونوں ایک ہی شعلے سے پھُونک دیئے گئے ہیں۔

نوجوان سپاہی اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک پیڑ کے تنے سے لپٹ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اُس کے سائے میں بیٹھ کر انتہائے غم میں تپتے ہوئے صحرا کے نظارہ پر غور کرنا شروع کیا اور تنہائی کا غم مٹانے کے لئے ایک مرتبہ زور سے چلایا لیکن اس چیخ کی آواز سوائے اس کے دل کے اور کہیں نہ گونج سکی۔

یہ سپاہی بائیس سال کا جوان تھا۔ اس نے اپنی بندوق بھری اور پھر یہ کہہ کر "ابھی کافی وقت ہے" بندوق زمین پر رکھ دی۔ صرف یہی اس کی رفیق تھی جو اس کو نجات دلا سکتی تھی۔

اس کو نیلا آسمان اور چمکتی ہوئی زمین دیکھ کر فرانس کا خیال آنے لگا، اپنے عزیز دوستوں کے چہرے دکھائی دینے لگے اور اور پیرس کے در و دیوار کی بُو اُس کی ناک میں آنے لگی۔ پھر اس کو ایک مرتبہ اپنی موجودہ حالت کا خیال آیا اور وہ اپنے آپ کو تسکین دینے کے لئے پہاڑی کے دوسری طرف گیا۔ یہاں کچھ پھٹے ہوئے کمبل کے ٹکڑوں سے پتہ چلتا تھا کہ یہ جگہ آباد رہ چکی ہے، اس نے نگاہ اُٹھا کر درختوں کو دیکھا تو وہ کھجوروں سے لدے ہوئے نظر آئے۔ زندگی کے خیال نے پھر ایک مرتبہ اس کے سینے کو اُمیدوں سے بھر دیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس وقت تک رُکوں گا جب تک کہ یہاں سے کچھ عرب گزریں یا توپ کے چلنے کی آواز آئے کیونکہ اس وقت نپولین مصر ہی میں تھا۔

اُس نے تازہ کھجوریں توڑ کر کھائیں اور محسوس کیا کہ زندگی کی ایک لہر اس کے بدن میں دَوڑ گئی ہے۔ اب اس کو خیال آیا کہ شاید چشمے پر رات کو وحشی جانور پانی پینے آتے ہوں لہذا اپنے آپ کو محفوظ کر لینا چاہیئے چنانچہ اس نے چند لکڑیاں جمع کر کے ایک رُکاوٹ سی قائم کر لی۔ کھجور کے پتے جوڑ کر اپنے سونے کے لئے ایک چٹائی تیار کی اور تھکا ماندہ اس جھونپڑے میں لیٹ کر سو گیا۔

آدھی رات کے وقت اس کی آنکھ کسی غیر انسانی آواز کی وجہ سے کھلی، اس نے اندھیرے میں اُٹھ کر دیکھنا شروع کیا اور معلوم کیا کہ دو چھوٹی چھوٹی روشن چیزیں اس کے سامنے رقص کر رہی ہیں۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید اپنی آنکھوں کا عکس اُس کو دکھائی دے رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کو معلوم ہُوا کہ یہ کسی جنگلی جانور کی آنکھیں ہیں۔ چیتے، شیر اور گھڑیال کے خیال سے اس کے جسم میں لرزہ آ گیا۔

یہ جانور اُس کے بالکل نزدیک تھا اور اس کی متعفن سانس سپاہی کی ناک میں گھس رہی تھی۔ اس وقت اس کی حالت

انتہائی رحم کے قابل تھی، اس لئے کہ اس کے ذہن میں ہر قسم کے وحشی جانوروں کا خیال آرہا تھا اور وہ بے حد بیکسی کے خوف میں گرفتار تھا۔ یکایک چاند افق سے رفتہ رفتہ ابھرا جس نے سپاہی کے سامنے ایک چمکدار خوبصورت چیتے کی کھال نمایاں کر دی۔

جنگل کا بادشاہ سپاہی کی طرف مُنہ کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں آہستہ سے کھلیں اور پھر بند ہوگئیں۔ سپاہی کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور طرح طرح کے خیالات کا ایک دریا اُس کے دماغ میں موجیں مارنے لگا۔ ایک دفعہ اس نے سوچا کہ اس کو اپنی بندوق سے مار دے مگر پھر اس کو خیال آیا کہ وہ اس قدر نزدیک ہے کہ اگر جاگ اُٹھا تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ دو مرتبہ اس نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا لیکن دونوں مرتبہ جانور کے جاگ اُٹھنے کے خیال نے اُس کو اس فعل سے روکے رکھا۔ آخر کار اُس نے سوچا کہ اب صبح تک انتظار کرنا چاہیئے۔

صبح ہوئی تو شیر کا خوبصورت جسم سپاہی کو واضح طور پر نظر آنے لگا۔ اس کا مُنہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ جسم پر گول گول چھلّے اس کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہے تھے۔ غالباً یہ مادہ تھی۔

بلّی کی یہ بڑی بہن شاہی انداز سے لیٹی ہوئی خراٹے لے رہی تھی۔

کچھ عرصے کے لئے سپاہی کی ہمّت نے اس کو جواب دے دیا۔ لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دن کی روشنی میں وہ کسی قدر دلیری محسوس کرنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ اب تک وہ عرب بردہ فروشوں کی بندوقوں کا نشانہ بن چکا ہوتا چنانچہ اپنے آپ کو مردہ خیال کرتے ہوئے وہ شیر کا ہمت سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوگیا۔

سُورج کی روشنی کے ساتھ شیرنی نے آنکھیں کھولیں، اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور جمائی کے ساتھ انگڑائی لیتے ہوئے سپاہی کی طرف نہایت غور سے دیکھا۔

"بڑی حسین بلّی ہے" سپاہی نے غور کیا "اچھا خوب بن سنور لو تُم سے آج ملاقات ہوگی" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے خنجر پر ہاتھ ڈالا۔

شیرنی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ سپاہی نے بھی اپنی نگاہیں اس پر جما دیں تاکہ اُس پر مسمریزم کا اثر ہو جائے وہ اس قدر نزدیک آگئی کہ سپاہی نے ہمّت کر کے اپنا ہاتھ اس کے سر سے دُم تک پھیرا۔ دو تین مرتبہ ہاتھ پھیرنے سے اس نے اپنی دُم محبت اور اُنس سے پلی ہوئی بلّی کی طرح اُٹھالی۔ سپاہی نے بار بار اس کے اُوپر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور محسوس کیا کہ شیرنی کو بھی لُطف آرہا ہے۔ پھر وہ ایک مرتبہ اس کو کھڑا چھوڑ کر باہر نکل گیا اور پہاڑی کی دوسری طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں نہایت آہستگی سے جیسے ابابیل ہوا میں تیر رہی ہو شیرنی سپاہی کے پاس آگئی اور اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ سپاہی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا کہ اس کو خنجر سے ہلاک کر دینا چاہیئے مگر اُس کے سر کی سختی نے معاملہ ذرا ٹیڑھا کر دیا۔

پھراس نے سوچا کہ اس کی گردن میں خنجر بھونک دے لیکن شیرنی نے اپنا سراس کے قدموں پر رکھ کر اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جس سے وہ مسحور ہوگیا اور پھر اطمینان سے کھجوریں کھانے لگا۔ کھجور کی گٹھلی پھینکتے وقت اس نے دیکھا کہ وہ ابھی پوری طرح اس پر اعتماد نہیں رکھتی اور ہر بار جھجکتی ہے۔

شیرنی نے ایک دفعہ سپاہی کو اُوپر سے نیچے تک جانچا اور جب وہ کھجوریں کھانا ختم کر چکا تو اس کا بُوٹ چاٹنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بُوٹ گرد و غبار سے بالکل صاف ہوگیا۔

سپاہی سمجھا کہ یہ جنگل کی شہزادی اس وقت چونکہ پیٹ بھر چکی ہے اس لئے خاموش ہے لیکن جب بھُوک ہوگی تو مجھے نہ چھوڑے گی۔ شیرنی قدآور اور قوی تھی۔ سپاہی نے خیال کیا کہ وہ اگر ادھر اُدھر ہٹ جائے تو بہتر ہوتا کہ اس کے جی سے میرا خیال نکل جائے۔ اب اس نے غور کیا تو دیکھا کہ اس کے مرے ہوئے گھوڑے کی لاش تالاب کے قریب پڑی ہے، اور آدھی سے زیادہ کھائی جا چکی ہے، اُس کا دِل دہل گیا اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ شیرنی نے دراصل اس کے گھوڑے کو کھایا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ اس سے بھاگنا ناممکن اور بیکار ہے۔ لہذا اُسے مانوس بنانے اور محبت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہی کہ اسی طرح شاید نجات مِل سکے۔

وہ لَوٹ کر آیا اور شیرنی سے کھیلنے لگا۔ شیرنی بھی انس ظاہر کرنے لگی۔ سپاہی نے اُس کے کان کھینچ کر اُسے پیٹھ پر لَوٹ دیا اور جسم پر ہاتھ پھیرا لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔

اس پر سپاہی کو اپنے عہدِ رفتہ کا خیال آیا۔ اُس نے اپنی پُرانی معشوقہ کے متعلق سوچا کہ وہ کس قدر حسد اور غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ اور یہ کہ ایک مرتبہ اُس نے اس کو خنجر دکھا کر یہ کہا تھا کہ اگر تم عہد شکن اور بےمروت ثابت ہوئے تو میں اس سے کام لُوں گی۔ اس کو اس خنجر کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس نے اس کا نام پیار سے "حسین حاسدہ" رکھ دیا تھا اب وہ اسی نام سے شیرنی کو پکارتا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگتی۔

اس نے شیرنی کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "پیاری حسین حاسدہ، تُم موت اور زندگی میں میری شریک ہو، دیکھو بے وفائی نہ کرنا"

اب اُسے معلوم ہونے لگا کہ جنگل آباد ہے۔ اگرچہ سپاہی رات کو کافی حفاظت کر کے سونا چاہتا تھا لیکن وہ رات آرام سے کاٹتا۔ جب وہ صبح اُٹھتا تو شیرنی وہاں نہ ہوتی تھی۔ وہ پہاڑی پر جاتا جہاں سے وہ کُودتی ہوئی اُس کے پاس آجاتی۔ اس کے مُنہ میں شکار کا خُون لگا ہوتا تھا۔

انسان کی قوتِ تخیل بہت زبردست ہے۔ جب سپاہی کو یقین ہوگیا کہ اب میں خطرے سے باہر ہوں تو اس نے

خیالوں میں محو رہنا شروع کر دیا وہ ریگستان کی چمکتی ہوئی ریتلی زمین اور رات کے جگمگاتے ہوئے آسمان کو شاعرانہ نگاہ سے دیکھنے لگا مگر جب اس سے بھی کام نہ چلا کیونکہ انسان کی فطرت میں محبت کرنا ہے تو اُس نے شیرنی سے ایک عجیب قسم کی محبت شروع کر دی۔ اور اُس کا بیشتر وقت اس سے کھیلنے میں گزرنے لگا۔ ایک دن یوں ہُوا کہ وہ شیرنی کے ساتھ بیٹھا کھیل رہا تھا کہ آسمان پر ایک بہت بڑا عقاب ہوا میں تیرتا ہُوا نظر آیا۔ سپاہی نے دُور تک اس کا اپنی نگاہوں سے پیچھا کیا۔ یکایک شیرنی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ سپاہی اور شیرنی نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیر تک دیکھا۔ سپاہی نے اپنا ہاتھ اپنی محبوبہ کے سر پر پھیرا۔ نہ معلوم کیا چیز تھی جس نے شیرنی کے جذبات کو ٹھیس لگائی اور اس نے اپنے خوفناک دانتوں سے سپاہی کا پیر پکڑ لیا لیکن نہایت نرمی سے۔ سپاہی نے خیال کیا کہ اب یہ مجھے ضرور کھا جائے گی۔ یہ خیال کرتے ہی اُس نے اپنا خنجر نکال کر اس کے گلے میں پوری قوت سے گھونپ دیا۔ شیرنی کے دل کے عمیق ترین حصّہ سے ایک درد انگیز آواز نکلی اور وہ سپاہی کو محبت بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی جسم و روح کے تعلق سے آزاد ہو گئی۔

شیرنی کی آخری چیخ کے بعد بیابان کی خاموش فضا نے سپاہی کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔

(بالزک)

ابن الاسلام زبیری

کیسی مغموم ہے وہ روح جو غمزدۂ محبت نہ ہو

کسی ایسی ہستی کا نہ پایا جانا، کہ صرف اسی سے خلائے عالم پُر کیا جا سکتا ہو کیسا اُداس منظر ہے۔ کس قدر درست ہے یہ خیال کہ محبوب ہو جانا گویا خدا ہو جانا ہے، ایک شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ خدا محبوب پر رشک کرتا ہے، اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ ساری کائنات صرف رُوح کے لئے پیدا کی گئی ہے اور رُوح صرف محبت کے لئے۔

زیرِ نقاب ایک ہلکا سا تبسّم روح کو ایوانِ خواب میں داخل کرنے کا ایک راستہ ہے

خدا دنیا کی ہر شے میں موجود ہے مگر وہ اُسے چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودات تاریک ہے لیکن کسی سے محبت کر لینا اُسے روشن بنا دینا ہے۔

(وکٹر ہیوگو)

موپساں اور ٹالسٹائی کا نظریۂ فنونِ لطیفہ

گائی دا موپساں، فرانسیسی شاعر و افسانہ نگار ۵ راگست ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوا۔ اُس کا دادا ایک متموّل زمیندار تھا جس نے اپنی موت پر اپنے لڑکے یعنی موپساں کے باپ کے لئے کافی جائداد چھوڑی۔

موپساں نے روئن لیس کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ابھی فلسفے کی تعلیم ہی حاصل کر رہا تھا کہ اُس نے اپنی پہلی کتاب اشعار کے ایک مجموعے کی صورت میں شائع کی۔

ایامِ جوانی میں موپساں ادبی گفتگوؤں میں بہت کم حصّہ لیا کرتا تھا۔ اگرچہ اُس کے ملنے والے طرگنیف، الفونسو داد ے اور زولا ایسے بلند پایہ ادیب و انشا پرداز تھے مگر یہ ملاقاتیں غالباً ادبی مشاغل کے سلسلے میں نہ تھیں اس لئے کہ ان ادبا کی نظر میں موپساں اس وقت صرف ایک کھلاڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک دوسرے مجموعۂ اشعار کی اشاعت کے کچھ سال بعد اُس نے ایک اخبار میں اپنے افسانے چھپوانے شروع کئے۔ اُس کے پہلے افسانے (Boule de Suif) نے ادبی دُنیا پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ واقعی ایک کامیاب افسانہ نگار ہے اور اُس میں اس صنف سے متعلق تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس افسانے کے طبع ہونے پر عوام کے علاوہ اُس کے ہم عصر انشا پردازوں کے تعجب کی بھی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنھوں نے اُن کاغذ کے چند پرزوں پر کسی پختہ افسانہ نگار کے معجز نما افکار جلوہ گر پائے۔ ——— چند اور افسانوں کی اشاعت نے فرانس کے ہر اُس ادبی حلقے کو جو مصنف کے انتخابِ مضمون سے متنفر تھا یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ موپساں واقعی اپنے فن کا بہترین ماہر ہے۔

موپساں، شاید اپنے وقت کا بہترین مختصر افسانہ نویس ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اُس کا پہلا افسانہ La Boule de Suif فن کے لحاظ سے لاثانی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی مصنف نے اپنی ادبی سرگرمیوں کی ابتدا ایک فقید المثال شاہکار سے کی ہو ——— یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ خود موپساں کی تصانیف میں ایسا کوئی افسانہ موجود نہیں ہے جو اس پہلی کاوش کا مدِ مقابل ٹھیرایا جاسکے۔

موپساں کی ادبی زندگی صرف دس سال کے قلیل عرصے تک جاری رہی۔ اس عرصے میں اُس نے بے شمار افسانے اور نصف درجن ناول سپردِ قلم کئے جو ادبی دُنیا میں کافی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔

موپساں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی تصانیف میں (Naturalism) کو تباہ کردیا ہے اس لئے کہ وہ اسے (حقیقت نگاری) کی آخری حد تک لے جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موپساں نے کبھی مُوجد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ صرف انسان کی زندگی کو بعینہٖ اُسی طرح بیان کرتا تھا جیسی اُس کی آنکھیں دیکھا کرتی تھیں یہ دوسری بات ہے کہ دُنیا کے لوگوں کے نزدیک اس کے مشاہدے کے نتائج بعض اوقات ناگوار ہوتے ہیں۔

بعض حضرات موپساں کو اس فن کے لحاظ سے رُوسی افسانہ نگار اُنطون چیخوف کا ثانی قرار دیتے ہیں —— یہ ایک عظیم غلطی ہے۔ ان دونوں افسانہ نویسوں کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ امر روشن ہوجاتا ہے کہ اُن کی نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ موپساں کی نظر انسان میں حیوانی جذبات دیکھتی ہے اور چیخوف انسانیت کے عمیق ترین گڑھوں میں محبت اور اُمید کی تلاش کرتا ہے۔

بیشک چیخوف بھی موپساں کی طرح ایک مصوّر تھا اور اُس نے ہمارے سامنے وہی پیش کیا جس کا اُس نے اپنے گردوپیش مطالعہ کیا مگر ایسا کرتے وقت وہ ہمیشہ اُس زندہ چنگاری کی جستجو کیا کرتا تھا جو سرشتِ انسانی میں نہاں ہے —— یہی وہ فرق ہے جو ان افسانہ نگاروں کے بظاہر یکساں فن میں پوشیدہ ہے۔

موپساں بھی اپنے اُستادؔ ہی کی طرح ایک بڑا اہلِ طرز (Stylist) ہے۔ اُس کی تصانیف کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت موزوں لفظ کی جستجو میں رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اُس نے ہر مقام پر غیر ضروری الفاظ سے اجتناب کیا ہے۔ موپساں کے آرٹ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ نیکی کو بدی پر ترجیح نہیں دیتا، نہ وہ ایک کردار کو دوسرے کردار پر برتری بخشتا ہے، اور نہ وہ اپنی حکایت بیان کرتے وقت درمیان میں ٹھہر کر زندگی کے معانی پر بحث کرنا شروع کرتا ہے —— دراصل اُس کا مقصدِ وحید اپنے مشاہدات بیان کرنا ہے۔ اُس کی طرزِ نگارش بہت سادہ مگر پُرمعنی ہے۔ وہ پھیکے سے پھیکا لفظ بھی استعمال میں لے آئے گا اگر وہ اُس کی تصویر میں صحیح نقش کا کام دے سکتا ہے۔

موپساں کی آخری تصانیف میں یک لخت ایک غیر معمولی تغیّر رُونما ہوا۔ یعنی اُس کے افکار میں پُرازالم زندگی سے جذبۂ ہمدردی کا اظہار جھلک دکھانے لگا۔ یہ ہمدردی ہمیں اُس کے اکثر افسانوں میں بھی نظر آتی ہے جو اُس نے ۱۸۹۰ء میں قلمبند کئے۔ (La Vie Errante) کی اشاعت کے بعد جو سیاحت سے متعلقہ تحریروں پر مشتمل ہے موپساں کی ادبی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ادب سے کنارہ کش ہوکر وہ مذہب میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اس عرصے تک اس کے اعصاب، شراب کی کثرتِ استعمال اور جسمانی بے اعتدالیوں کی وجہ سے بالکل خراب ہوچکے تھے۔ چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی وہ فالج ایسے مہلک مرض کا شکار ہوا۔ اس مرض کی غیر معمولی تکلیف سے تنگ آکر اُس نے جنوری ۱۸۹۲ء میں خودکشی کا اقدام کیا مگر بچ گیا۔ آخر وہ ۶ جولائی ۱۸۹۳ء

لہ فلابیئر (Flaubert)

کو پیرس میں اس جہاں سے رخصت ہو گیا —— کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آخری ایام بہت تکلیف میں گذارے۔

موپساں، انگریزی افسانہ نگاروں ایڈگر ایلن پو اور او ہنری کی طرح مختصر نویسی کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ موپساں کا درجہ ان باکمال افسانہ نگاروں سے بھی بلند ہے۔ یہ فوقیت اُسے اپنے انتخاب مضامین کے وسیع تنوع کی وجہ سے حاصل ہے —— موپساں نے " مافوق الفطرت افسانہ نگاری " کی مشکل صنف میں بھی ایلن پو کی طرح نہایت کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔

اگر موپساں کچھ دیر اور زندہ رہتا تو یقین تھا کہ وہ اپنی موجودہ تصانیف سے کہیں زیادہ اہم تحریریں چھوڑتا کیوں کہ آخری ایام میں وہ اپنے نظریے کو بالکل بدل چکا تھا! بہرحال ادب سے دلچسپی لینے والے حضرات اب بھی اِس جواں فکار افسانہ نویس کی ادبی خدمات کے معترف ہیں

روس کے شہرہ آفاق انشا پرداز و تمثیل نگار کاؤنٹ لیو طالسطائی نے موپساں کے افسانوں کے روسی تراجم کا تعارف لکھا ہے جس میں اس روسی مفکر نے موپساں کی تحریروں پر ایک عالمانہ تنقید کی ہے۔ اس تعارف کے چند اقتباسات نقل کرنے سے پیشتر ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ طالسطائی کے مشہور نظریۂ صنعت کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

طالسطائی کی نظر میں صرف وہی دماغی تخلیق آرٹ ہو سکتی ہے جو متعدی (Infectious) ہو، یعنی وہ اپنے خالق کے احساسات دوسرے دماغ پر منتقل کر سکے۔ اس طرح وہ ہر اُس پارۂ صنعت کو آرٹ تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہے جو ناقابلِ فہم ہو۔ ہم یہاں خود طالسطائی کے الفاظ درج کرتے ہیں:-

" اپنے احساسات کو کسی دوسرے شخص کے دل و دماغ میں، حرکات، نقوش، آواز کے زیر و بم، الفاظ یا رنگوں کے ذریعے سے اس طرح پیدا کرنا کہ اُس پر وہی حالت طاری ہو —— یہ ہے آرٹ کی خاصیت "

" آرٹ یہ ہے کہ کوئی شخص ارادۃً بیرونی اشارات کے ذریعے سے اپنے احساسات دوسرے دماغ پر نہایت کامیابی سے منتقل کرے اور معمول عامل کے اُن احساسات سے پوری طرح متاثر ہو "

طالسطائی آرٹ کو حُسن کاری، خوبصورت اشیا کا پیدا کرنا، ایک کھیل یا ذریعۂ مسرت نہیں مانتا۔ وہ آرٹ کو ایک ذریعۂ اتحاد کہتا ہے جو انسان کو انسان کے ساتھ احساسات کی ایک ہی لڑی میں منسلک کر دے —— ارسطو، افلاطون، سقراط اور دیگر حکمائے یونان کا بھی کسی حد تک آرٹ کے متعلق یہی نظریہ رہا ہے۔ مگر وہ اِسے صرف مذہبی تعلیم کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

طرگنیف[1]، طالسطائی کو موپساں کے افسانوں کا ایک مجموعہ دے کر اُس سے سفارش کرتا ہے کہ وہ اُس نوجوان فرانسیسی افسانہ نگار کے افکار کا ضرور مطالعہ کرے۔ اس کے علاوہ طرگنیف، طالسطائی کو موپساں کے متعلق چند ایسی باتیں بھی کہتا ہے جو اُس کے لئے

[1] طالسطائی کا ایک ہم عصر افسانہ نگار

بہت تعجب خیز ہوتی ہیں۔

طالسطائی تعارف میں لکھتا ہے:۔

"چونکہ میں اُس زمانے میں جب طرگنیف نے مجھ سے موپساں کی ایک تصنیف کا مطالعہ کرنے کے لئے کہا اپنا نظریۂ حیات[1] بالکل تبدیل کر رہا تھا اس لئے میرے لئے ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنا جن کے متعلق خود طرگنیف کے الفاظ بہت عجیب سے تھے، بہت مشکل تھا مگر چونکہ مجھے طرگنیف کو ناراض کرنا مقصود نہ تھا اس لئے میں نے اُس کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔

اس مجموعے کی پہلی کہانی (La Maison Tellier) کا نفسِ مضمون فی الواقع بہت عامیانہ اور بازاری تھا مگر اس کے باوجود میں مصنف کی قابلیت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ واقعی ایک قدرتی عطیے کا جسے ہم قابلیت کے نام سے پکارتے ہیں، مالک تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں اس قابلیت میں وہ امر جو اُن تین اصولوں میں (جو آرٹ کے لئے لازم و ملزوم ہیں) سب سے زیادہ اہم ہے، نہ پا سکا۔

(۱) ایک صحیح یعنی اخلاقی رشتہ مصنف کا اپنے مضمون کے ساتھ (۲) اظہار کی وضاحت یا حسنِ تشکیل (۳) خلوص یعنی اپنے مضمون سے متاع کا پورا اخلاص۔

ان تین چیزوں میں سے موپساں صرف آخری دو کا بڑی حد تک مالک ہے مگر اُس کے افکار میں سب سے ضروری امر کا فقدان ہے یعنی اُس کا رشتہ اپنے انتخاب کردہ مضامین کے ساتھ اخلاقی طور پر بالکل غیر درست ہے۔

میں اُس کی کتاب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنے مشاہدات کو جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں بیان کرنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے، وہ ایک خوبصورت طرزِ نگارش کا مالک ہے، جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا بہت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ اُس کے افکار میں وہ تعدیہ (Infection) بدرجہ اتم موجود ہے جس کے بغیر آرٹ، آرٹ نہیں ہو سکتا۔ مگر ان امور کے باوجود بدقسمتی سے وہ اُس ضروری عنصر سے بالکل محروم ہے جس کے بغیر آرٹ ہرگز بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اُس کی تحریروں میں اخلاقی رشتہ بالکل مفقود تھا —— دیگر الفاظ میں وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اُن باتوں کو بیان کرنا پسند کرتا ہے جو اُسے پسند نہ کرنی چاہئے تھیں اور نہ اُن کے بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

چنانچہ بدقسمتی سے مصنف نے اس زیرِ نظر کتاب میں بڑے شوق و محبت سے بیان کیا ہے کہ کس طرح عورتیں مردوں کو دامِ گناہ میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور کس طرح مرد عورتوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے رغبت دلاتے ہیں اور وہ ملک کے

---

[1] طالسطائی نے اُس وقت آرٹ کی سرگرمیوں سے بالکل علیحدہ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا —— دیکھو (Contemporary Russian Literature) از پرنس ڈی ایس مرسکی۔

مزدور پیشہ لوگوں کو نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ اُن کو حیوانوں سے بدتر پیش کرتا ہے۔

زندگی کے صحیح نظریے کا فقدان، مزدور پیشہ لوگوں کی دلچسپیوں سے تغافل اور اُن کی بھدی تصویرکشی، وہ بڑا بھاری نقص ہے جو فرانس کے اکثر انشا پردازوں کے افکار میں موجود ہے۔ اُن میں موپساں بھی شامل ہے جو نہ صرف پیشِ نظر افسانوں میں بلکہ ہر اُس مقام پر جہاں وہ عوام کے متعلق کچھ تحریر کرتا ہے، اِن لوگوں کو ہمیشہ وحشی اور بھدے حیوان دکھاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرانسیسی مصنف اپنی قوم کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں مگر اس حقیقت کے باوجود کہ مجھے فرانسیسی کاشتکاروں کے درمیان بود و باش کا موقع نہیں ملا میں یہ ہرگز تسلیم نہیں کرسکتا کہ وہ لوگ واقعی ایسے کاروکردار کے مالک ہیں جیسا کہ یہ مصنف ہمیں بتاتے ہیں۔

اگر فرانس جس نے اتنی نامور شخصیتیں پیدا کی ہیں جس نے آرٹ، ادب، سائنس اور انسان کی اخلاقی ترقی کے لئے اتنی خدمات انجام دی ہیں۔ اب بھی وہی فرانس ہے تو وہ مزدوری پیشہ جماعت جس کے کاندھوں پر فرانس قائم رہا ہے کبھی وحشی اور حیوان اور روحانیت سے عاری نہیں ہوسکتی چنانچہ میں موپساں اور اسی قسم کے دیگر مصنفوں کی بیان کردہ کہانیوں کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھ سکتا۔ میری نظر میں وہ انشا پرداز جو موپساں کی طرح صرف عورتوں کی گردنوں اور کولھوں کی تعریف میں رطب اللساں ہیں اور جو مزدوری پیشہ لوگوں کی زندگی کو تمسخر آمیز لہجے میں بیان کرتے ہیں ایک عظیم عذا عانہ (عذاعانہ ندامہ) غلطی کے مرتکب ہیں اس لئے کہ وہ صرف جسمانی امور کو لے کر باقی تمام ضروری چیزوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ موپساں کا خیال ہے کہ اخلاق و بداخلاقی اور نیکی و بدی میں تمیز کرنا کسی آرٹسٹ کا کام نہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک کامیاب مصور نے مجھے اپنی تیار کردہ تصویر دکھائی جس میں ایک مذہبی جلوس دکھایا گیا تھا۔ یہ تصویر فن کے لحاظ سے بہت خوب تھی مگر اس میں بھی صناع کا مضمون سے رشتہ مفقود تھا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا "کیا تم ان مذہبی رسوم کو اچھا سمجھتے ہو، کیا ایسے جلوس نکلنے چاہئیں؟"

میرے اس متحیر کن جواب پر وہ صرف اسی قدر کہہ سکا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور نہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ میرا کام اپنے مشاہدے کی تصویرکشی ہے۔

میں نے اُس سے پھر سوال کیا "مگر کم از کم تمہیں یہ جلوس پسند تو ہونگے"۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔

"تو پھر تمہیں یہ رسوم ناپسند ہونگی"۔

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں"۔ یہ تھا وہ جواب جو اُس کامیاب و بہترین فن کار مصور نے مجھے دیا ——— مصور جو زندگی کی تصویرکشی تو کرتا ہے مگر اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس مضمون سے جس پر وہ طبع آزمائی کر رہا ہے نفرت کرتا ہے یا محبت۔

"بدقسمتی سے موپساں بھی اسی تاریکی میں تھا۔ اور بدقسمتی سے اُس کے گرد و پیش کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ آرٹ کی صحیح

خدمت صرف حسن کاری تصور کی جاتی تھی ——— عورت کا حسن، جو نوجوان اور شکیل ہو، خاص کر برہنہ ہو اور پھر اُس کے ساتھ مرد کا شہوانی تعلق۔

"یہ غلط نظریہ نہ صرف موپساں اور اُس کے ہم عصر انشا پردازوں کے پیش نظر تھا بلکہ اُس وقت کے فلسفہ[1] دان حضرات یعنی ملک کی نوجوان نسل کے اُستاد بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔"

"مگر موپساں فنی مہارت کا مالک تھا یا وہ اپنے مشاہدات بیان کرتے وقت بلا ارادہ 'حق' کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ دراصل وہ بلا ارادہ ہر اُس چیز میں جس میں وہ نیکی کی جستجو کرتا بدی دیکھ کر بیان کر دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے اُس کی تمام تصانیف میں بجز ایک ناول کے صحیح راستے سے بھٹکا ہوا دیکھتے ہیں ——— اگر کسی جگہ وہ بُرائی کو بُرائی اور نیکی کو نیکی تسلیم کرتا ہے تو دوسرے مقام پر وہ بدی کو نیکی قرار دیتا ہے ——— یہی وہ چیز ہے جو کسی فنی تخلیق کی بنیادیں تباہ کر دیتی ہے، وہ بنیادیں جن پر آرٹ کی استواری کا انحصار ہے۔

"موپساں نے اپنے دو ناولوں میں رشتۂ حیات کو صحیح طور پر بیان کرنے کی کامیاب سعی کی ہے مگر جونہی وہ مندرجہ بالا فیشن ایبل نظریہ کی طرف پلٹا تو یہ خیال کرتے ہی کہ صناع کا کام صرف حسین اشیا کی تخلیق یعنی حسن کاری ہی ہے اُس کے افسانے آرٹ کے دائرے سے باہر ہو گئے۔"

"خوش قسمتی سے موپساں نے چند ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں وہ اِس غلط نظریے پر کاربند نہیں رہا۔ انہی چند افسانوں میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ احساسِ اخلاق کی چنگاری اس مصنف کے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔"

"اگر موپساں کی عمر نے وفا کی ہوتی تو یقیناً ہمیں اُس سے آرٹ کی صحیح خدمت کی توقع تھی۔

سعادت حسن منٹو

ساری کائنات کا سمٹ کر ایک ہستی میں سما جانا اور اسی ہستی کا پھیل کر آئینہ وسعت اختیار کر لینا ——— یہ ہے محبت

محبت سلام ہے فرشتوں کا تاروں کی خدمت میں

وکٹر ہیوگو

---

[1] یہ اشارہ فرانس کے مشہور فلسفی (Renan) کی طرف ہے۔

ماتمِ دلبری

دو دوست طعامِ شب ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے ہوٹل کے دریچے میں سے جھانکا۔ سڑک لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ وہ شام کی گرم ہوا محسوس کر رہے تھے جو گرمی کی راتوں میں پیرس کا خاص تحفہ ہے اور جو بدن سے مس ہوتے ہی سیاحوں کو گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دریچوں میں سے باہر جھانکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جوان کے دِل میں یہ خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ وہ نیچے اُتر جائیں اور باہر کہیں آبادی سے دُور چل بسیں شاداب مرغزاروں میں، خوابوں کی دُنیا میں جہاں بہتے ہوئے دریاؤں پر ماہتاب نور برسا رہا ہو اور جہاں سبزہ زار کا گوشہ گوشہ بلبلِ ہزار داستان کے رسیلے نغموں سے سرشار ہو۔

دونوں میں سے ایک دوست نے جس کا نام ہنری سائمن تھا لمبی سانس لے کر کہا "آہ! میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ کس قدر اُداسی ہے، دوست۔ قبل ازیں میں ایسی ہی شام کو اپنے بدن میں اِک آگ سی محسوس کیا کرتا تھا مگر اب ——— بجھی ہوئی راکھ! تأسف! حسرت! زندگی کتنی تیز رفتار ہے!!!"

گو ہنری سائمن کی عمر کوئی پینتالیس برس کی ہوگی اور اُس کے سر پر کوئی بال نہ تھا تاہم اس کے اعضا کافی مضبوط تھے۔

پیٹر کارنیر نے جو جسم کا لاغر، عمر میں اس سے بڑا، نسبتہً زیادہ خوش دِل اور بذلہ سنج تھا جواب دیا "دوست! میں نے اپنے بڑھاپے کو دُنیا میں سب سے کم محسوس کیا ہے۔ میں ہمیشہ مسرور رہا ہوں۔ میں نے اپنے اوقات ہنسی، خوشی اور قہقہوں میں بسر کئے ہیں۔ اگر کوئی ہر روز بلا ناغہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا رہے تو وہ کارکنانِ عمر کی تبدیلیاں جو وہ ہر لحظہ کر رہے ہیں محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اُن میں آہستگی اور باقاعدگی ہوتی ہے۔ اور چہرے کے خدوخال دھیرے دھیرے اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ یہ انقلاب ہمیں ان دیکھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس انقلاب کا احساس ہی تو ہے جو روز بروز ہمارے دل و دماغ پر ایک تکلیف دہ صورت میں اثر پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس انقلاب کو اگر صحیح طور پر محسوس کرنا ہو تو چھ مہینے تک آئینہ کے نزدیک نہ جاؤ۔ پھر دیکھو! مگر عورت! میرے دوست! کتنی قابلِ رحم ہستی ہے۔ اس غریب کی مسرت، زندگی، تکبر، طاقت صرف اس کی خوبصورتی میں مضمر ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اِس نعمتِ عظمےٰ کی عمر صرف دس برس۔

میں آج تک اسی خیال پر اُدھار کھائے بیٹھا رہا کہ میں ابھی جوان ہوں گو میری عمر کا یہ پچاسواں برس گزر رہا ہے۔ اس طویل عرصہ میں مَیں نے نقاہت و ناتوانی کو اپنے پاس کبھی پھٹکنے نہیں دیا۔ میں ہمیشہ مسرور و شادماں رہا ہوں۔ مگر آہ اس تنزل کا حال

مجھ پر ایک عام مگر اس قدر اندوہناک صورت میں منکشف ہوا کہ جس نے کوئی چھ مہینے تک لطفِ زیست مجھ پر حرام کر دیا میں نے بھی لوگوں کی طرح زندگی میں کئی بار محبت کی ہے۔ آہ نہیں۔ ایک بار۔ بارہ سال قبل۔ جنگ سے تھوڑی مدت بعد میں نے پہلے پہل اُسے اٹریٹیٹ کے ساحل پر دیکھا۔ کوئی جگہ اتنی دلپذیر نہ ہوتی تھی جتنا یہ ساحل صبح سویرے نہانے کے وقت۔ یہ کوئی بہت لمبا چوڑا نہ تھا یوں سمجھو کہ گھوڑے کے نعل کی طرح چھوٹا اور گول۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے گھرا ہوا کٹے پھٹے ٹکڑے کوئی بندرگاہ کی طرح باہر نکلا ہوا کوئی اندر دھنسا ہوا۔ ایک تو کسی دیو کی ٹانگ کی طرح سمندر میں بہت دُور تک نکل گیا تھا۔ اُس کے دائیں کنارے عورتوں کا ایک جمِ غفیر موجود رہتا تھا۔ چٹانوں کے درمیان یہ مختصر سا قطعہ اُن کی چمکیلی رنگ دار پوشاکوں سے ایک چمن زار بنا رہتا تھا۔ آفتاب اپنی پوری تابانی سے ساحل پر، رنگا رنگ کے چھاتوں پر، اور نیلگوں سمندر کی امواجِ مضطرب پر چمکتا رہتا۔ ہر طرف سے مسرت اور خوشدلی ٹپکا کرتی۔ ہر شے مسکراتی معلوم ہوتی۔ تم سمندر کے کنارے گھڑی دو گھڑی کے لئے تماشائی بن کر بیٹھ جاتے، پھر دیکھتے رنگ رلیاں ـــــ زن و مرد بدن پر لپٹی ہوئی فلالین کی چادر کو چھوٹی چھوٹی ہلکی کف آلود موجوں میں داخل ہوتے ہی باہر پھینک کر اک گونہ تیز قدمی سے جو بعض اوقات ایک لطف آمیز کپکپی یا ضیق النفس کا موجب ہوتی سمندر کے ٹھنڈے پانی میں کود پڑتے۔

اس جگہ کمزور اور توانا جسم اپنی اصلی حالت میں نظر آتے ہیں۔ صرف یہیں حسن صحیح معنوں میں "از فرق تا بقدم" پرکھا جا سکتا ہے اسی جگہ میں نے پہلے پہل اُسے حسن کی تمام دلفریبیوں اور دلکشیوں میں لپٹے ہوئے دیکھا۔ دوست! بعض حسین و جمیل صورتیں پہلے ہی وار میں فتح حاصل کر لیتی ہیں اور ان کی لمبی لمبی سرمگیں پلکوں سے نکلی ہوئی "کوتاہ نگاہ" قلب کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر کر چین لیتی ہے۔ اُس کی آنکھوں کے اندر بھی ایک ایسی دلکشی پنہاں تھی جسے ایک بار دیکھ لینا اور پھر جان و دل سلامت بچا کر لے جانا انسان کے لئے بہت دشوار تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میری زندگی اور میری پیدائش کا مقصد صرف اُس شوخ اور چنچل لڑکی کی محبت ہے۔ میں نے اپنی متاعِ دل و جان اُس حسینہ کے قدموں میں ڈال دی۔ وہ میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے مجھے اُس کا خیال رہنے لگا۔ اس طرح محبت کے ہاتھوں ایک عورت کا غلام بن جانا کتنا مہیب و پرکیف مشغلہ ہے۔ ہم اسے ایک طرح کی سزا بھی خیال کرتے ہیں مگر ہائے اُس بربادئ شادماں پر ہزاروں شادکامیاں قربان اور لاکھوں مسرتیں فدا۔

اُس کا قدِ رعنا، اس کے پتلے پتلے ہونٹ۔ اس کے ہوا میں لہراتے ہوئے سیاہ گیسو اور چہرے کے بے عیب خد و خال میرے دل کی دھڑکن کو اس قدر تیز کر دیتے کہ مجھے اس کے دھڑکتے دھڑکتے رُک جانے کا احتمال ہونے لگتا۔ اس کا جنون میری رگ رگ میں سرایت کر تا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ہر شے میں مجھے وہ خود دکھائی دینے لگی۔ میں کتنی ہی دیر تک صرف اُس کے اُس خاص دلربایانہ انداز کو دیکھنے کی اُمید پر کھڑا رہتا کہ وہ کب اپنا نقاب اور دستانے اُتار کر اپنے پہلوؤں میں ایک دلآویز لچک اور

بازوؤں میں ایک ساحرانہ خم پیدا کرتے ہوئے انہیں کرسی پر رکھ دے۔ اُس کے بھڑکیلے ملبوسات بے نظیر ہوتے۔ خدا کی قسم اُس سی بیش قیمت اور خوشنما ٹوپیاں کسی لڑکی کے پاس نہ تھیں۔

آہ بالآخر اس کی شادی ہو گئی۔ اُس کا شوہر ہر شنبہ کو آتا اور دوشنبہ تک قیام کرتا۔ وہ مجھ سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہتا حالانکہ مجھے اس سے حسد نہ تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اس سے حسد نہ کرتا تھا مگر میری زندگی میں یہ پہلا شخص تھا جو میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

آہ! میں نے اس حسینہ کو کس جوش سے چاہا تھا۔ وہ حسینہ وہ معصومہ کتنی خوبصورت تھی۔ اُس کی اُٹھتی ہوئی جوانی میں مجھے اپنی زندگی حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُس کا حسن و جمال میری روح کی بالیدگی اور میرے دماغ کی تازگی کا موجب تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ پھول اور موسیقی کا دوسرا نام عورت ہے۔ میں کبھی یہ سمجھ نہ سکا کہ اُس کے تابدار پردۂ رخسار کے پیچھے، اس کے رسیلے لبوں کی ایک معمولی جنبش میں، بناگوش کی گولائی کے اندر اور اس کی خوش وضع ناک کی اُٹھان میں یہ زہرشکن حسن کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ اُس کا جسم موزونیت کا مجسمہ تھا۔

اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔ میرا آب و دانہ مجھے امریکہ لے گیا۔ اُس کے روئے تاباں سے اس قدر دور۔ میرا قلب ملول اور اور دماغ افسردہ رہنے لگا۔ اُس کے تصور سے اپنی ذہنی قوتوں کو ایک لمحہ کے لئے آزاد کرنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر رفتہ رفتہ میری طبیعت میں ایک سکون سا پیدا ہوتا چلا گیا اور میرے دماغ میں صرف ایک محبت آمیز یاد باقی رہ گئی دنیا کی ایک دلفریب، حسین اور عزیز ترین ہستی کی یاد جس کو واقعاتِ زندگی نے میری راہ میں لا ڈالا تھا۔

بارہ سال ایک عمر ہے مگر کسی نے اسے کبھی محسوس کیا؟ ایک برس دوسرے کے پیچھے دوسرا تیسرے کے بعد بیک روی سے گزرا جاتا ہے۔ یہ طویل مدتیں کبھی کسی نے محسوس کیں؟ ماضی پر نظر ڈالیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔ مگر یہ سفید بال کہاں سے نمودار ہو گئے۔ ہماری اتنی عمر کیونکر کٹ گئی۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند حسینوں کا ذکر ہے جب میں نے ساحل اٹریٹیٹ کے خوش آئند موسم کو الوداع کہی تھی

میں گذشتہ بہار کے موسم میں میز نزلیفٹی میں چند احباب کے ہاں مدعو تھا۔ عین اس وقت جب ٹرین روانہ ہوئی میرے ڈبے میں ایک بھاری بھرکم بھدی سی عورت چار بچیوں کو ہمراہ لئے داخل ہوئی۔ میں اس گول مول سی ماں کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا اس کی ہیٹ مانع تھی۔ وہ چونکہ بھاگ دوڑ میں جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہوئی تھی بیچاری کا سانس پھول گیا تھا۔ اُن لڑکیوں نے بیٹھتے ہی چپڑ چپڑ کی یاوہ گوئی شروع کر دی۔ میں نے چارو ناچار اخبار کھول لیا۔

ہم ایسنیرز کے پاس سے گزر رہے تھے جب میرے کانوں میں یہ آواز پڑی "جناب۔ معاف کیجئے گا ـــــ کیا آپ مسٹر کارنیر تو نہیں؟"

"جی ہاں بیگم صاحبہ"۔ یہ سنتے ہی وہ ایک مطمئن دلیر عورت کی طرح ہنسی تاہم اُس کی ہنسی اُداسی کی اِک نامعلوم سی جھلک کو چھُپا نہ سکی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید؟" میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ یہ چہرہ بہت آشنا معلوم ہوتا تھا مگر کہاں دیکھا تھا، کب! کچھ یاد نہ آتا تھا۔

"جی ہاں ——— ن نن نہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے مگر آپ کا نامِ گرامی یاد نہیں آتا۔

اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں اور کچھ شرما کر کہا "مسز جُولیا لیفر"

مجھ پر بجلی گر پڑی۔ ایسا تلخ حادثہ مجھے عمر بھر پیش نہ آیا تھا۔ میرا خون رگوں میں رُک گیا۔ میری آنکھوں کے آگے دھواں آگیا۔ دل سینے میں ڈوبنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے نقاب دھجیاں ہو کر اُڑ گیا اور میں ایک مہلک اور تلخ ترین حقیقت کی خون آشامیوں اور ہلاکتوں سے آشنا ہو رہا ہوں یہ وہ تھی ——— آہ، کہاں وہ، کہاں یہ بھدی، گنوار، موٹی عورت۔ اور پھر یہ کہ اس نے چار بچے بھی جن لئے تھے۔ جب میں نے آخری بار اُسے دیکھا تھا وہ کیا تھی اور اب؟؟؟ اِن چھوٹی چھوٹی چار جانوں نے اپنی ماں کی طرح مجھے اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ چار لڑکیاں اس کے بطن سے تھیں ۔ ماں کے چہرے کے کچھ نقوش اُن کے چہروں میں نشوونما پا رہے تھے۔ وہ قد میں ابھی سے لانبی تھیں۔ انہوں نے ماں کی جگہ لے لی تھی۔ وہ اب خود کیا تھی؟ وہ جو کبھی نخوت و ناز کا گہوارہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُسے کل ویسا دیکھا ہے اور آج ایسا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن تھا؟ ایک شدید قلق، ایک مہلک رنج میرے سینے میں جاگ اُٹھا۔ میرا دِل فطرت کے یہ ہلاکت خیز وظائف اور ناپائدار و بے رحمانہ مشغلے دیکھ کر باغی ہوگیا۔ میں نے دیوانوں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور اس کے بازو کو بے اختیارانہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں اِس معمّر عورت سے واقف نہ تھا۔ میں صرف اُس کی خوبصورت جوانی کو جانتا تھا جو مر چکی تھی۔ میرے ڈھلکے ہوئے آنسو اس جوانا مرگ پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ بھی انسان تھی لرز گئی۔ الفاظ اُس کے مُنہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلنے لگے۔

"م م میں بہت بدل گئی ہوں نا؟ اتنے طویل عرصہ کے بعد آخر ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں میں اب ماں بن گئی ہوں۔ صرف ماں۔ ایک اچھی ماں۔ الوداع ماضی ——— وہ بسر ہو چکا ختم ہو چکا ——— اُف یہ میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ اگر ہم زندگی میں کبھی ملے بھی تو آپ مجھے پہچان نہ سکیں گے ——— آپ بھی تو آخر وہ نہیں رہے۔ آپ کو دیکھ کر میں کتنی دیر یہی سوچتی رہی کہ کہیں مغالطہ نہ ہو۔ سر بھی تو سفید ہوگیا ہے۔ آخر بارہ سال کا عرصہ ——— بارہ سال ——— میری بڑی لڑکی دس برس کی ہوگئی ہے۔"

میں نے لڑکی کی طرف نگاہ پھیری، اُس کے نوخیز حسن میں کچھ کچھ وہی دلکشی وہی سحر تھا جو کبھی اس کی ماں کی ملکیت تھا۔ اگرچہ اس سحر میں ابھی وہ پختہ نکھار نہ آیا تھا تاہم اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ عنقریب اپنی ماں سے بہت کچھ ورثہ میں لے لیگی۔ مجھے انسانی زندگی اُس وقت بالکل ٹرین کے مانند معلوم ہوئی جو تیز و تند دوڑی جا رہی تھی۔ ہم میرز نبلیفٹی آپہنچے۔ میں نے اپنی دیرینہ رفیقہ کے ہاتھ پر ایک طویل بوسہ دیا۔ اور سوائے چند کمبخت رسمی لفظوں کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ جیسے میرے لبوں پر مہر لگ گئی ہو۔ میرا دماغ اُبل رہا تھا۔ بھلا مجھے اُس وقت گفتگو سوجھتی تھی!

میں اُس حسرتناک شام کو اپنے کمرے میں تن تنہا آئینے میں اپنا عکس خدا جانے کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ میں گذشتہ زمانہ یاد کر کر کے خیال ہی خیال میں اپنی پرانی بھوری مونچھیں اور سیاہ بال دیکھ رہا تھا اور موجودہ چہرے کا مقابلہ قیافہ کے زور سے اپنے نوجوان شگفتہ چہرے سے کر رہا تھا ـــــ آخر کار یہ دل بہلاوا ختم کرنا پڑا۔ میں اب بوڑھا تھا ـــــ بوڑھا ـــــ آہ بڑھاپا۔ بڑھاپا!!!

(موپساں)

باؔبر بٹالوی

آنسو

میرے دل میں آنسو ٹپک رہے ہیں
جیسے بارش ہو رہی ہو
یہ نقاہت سی کیا ہے
جو میرے دل میں رینگ رہی ہے؟

آہ! زمین اور چھتوں پر گرتی ہوئی
بارش کی نرم صدا!!
ماندہ دل کے لئے کتنا اثر رکھتی ہے!
آہ، بارش کی صدا!

آنسو بلا وجہ چھلکے جا رہے ہیں،
اس دل میں جو خود بیدل ہے!
کیا یہ دغا نہیں ہے؟

دل بلا وجہ محوِ گریہ و فغاں ہے
آہ یہ کیسا عذاب ہے
کہ اُس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی

(پال ورلین)

سعادت حسن

وِکٹر ہیوگو اور مسئلہ سزائے موت

ہم اس مضمون میں وِکٹر ہیوگو کی ایک تصنیف (The Last days of the Condemned) کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اُس نے اپنی جلاوطنی سے پہلے پیرس میں قلمبند کی تھی۔ اس کتاب کا نفسِ مضمون معاشری نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ فرانسیسی انشا پرداز انیسویں صدی میں فطرتِ انسانی کا بہترین ماہر تھا۔ معاشرہ کے پیدا کردہ عیوب اور اخلاقی تباہیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی ہر تصنیف میں ان کے خلاف احتجاج موجود ہے۔ وہ اُمرا کی تعیش پسندی کو نفرت وحقارت کی نظروں سے دیکھتا اور گرسنہ شکم و برہنہ جسم غربا کی حالت سے متاثر ہوتا۔ اُس کے نزدیک تمام عیوب معاشرہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان جب معاشرہ کی قیود سے آزاد ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنے یکطرفہ، غیر آئینی اور ناقابلِ قبول قوانین سے اُس کو مصائب و نوائب کے بھیانک گڑھے میں صرف اس خیال سے دھکیل دیتی ہے کہ اُس کی اصلاح ہو جائے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

جس بات نے ہیوگو کے دماغ کو حد سے زیادہ پریشان کیا، جس مسئلے نے ہیوگو پر راتوں کی نیند حرام کر دی، جس قانون نے اس کے قلم کو اعجاز بخشا وہ سزائے موت کا خونی فتوےٰ تھا۔ چنانچہ اُس نے سزائے موت کے مجرم کے اندرونی احساسات و قلبی کیفیات سے اثر پذیر ہو کر ایک کتاب (The Last days of the Condemned) لکھی جس کا ترجمہ "سرگزشت اسیر" اس کے نام سے ہو چکا ہے۔

اس کتاب کا اندازِ تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گزر کر اُن کے دل پر نقش ہو جاتا ہے یہ کتاب فی الحقیقت ایک بین الملی مسئلہ کی المناک داستان ہے۔ لرزہ خیز حالات اور دردناک مناظر اتنے مؤثر الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں کہ قاری کی رگ رگ میں جذباتِ رنج والم جاگ اُٹھتے ہیں اور سزائے موت کی وحشت و بربریت کا صحیح نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ایک مجرم کا روزنامچہ ہے جس نے آغازِ قید سے پھانسی کے دن تک کے واقعات اور حالات نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ جیل کی کوٹھری کے اندر قیدی کیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ کیا ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس باکمال مصنف نے سزائے موت کے سیاسی و معاشری پہلو پر بحث کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر حساس قلب اُس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"سرگذشتِ اسیر" میں وہ منظر سخت رقت خیز ہے جب مجرم اپنی اکلوتی لڑکی سے جیل کی کوٹھڑی میں ملتا ہے:-

"نازک کلی، معصومیت کی تصویر، میری لختِ جگر میری بھولی بچی میریؔ اپنی اماں کے ساتھ میرے کمرے میں آئی۔ تتلی ایسے خوبصورت لباس میں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھا کر اُس کے بالوں کو چومنا شروع کر دیا۔ کبھی اُسے چھاتی سے لگاتا اور نازک رخساروں کا بوسہ لیتا، کبھی بھینچ لیتا، میریؔ اِن حرکات پر حیران ہو کر اپنی اماں کی طرف دیکھ رہی تھی جو کونے میں اس منظر سے متاثر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔

"میریؔ! میری پیاری میریؔ" یہ کہہ کر میں نے اُسے اپنی رنج والم سے پُر چھاتی کے ساتھ زور سے بھینچ لیا۔

"ہائے جناب! آپ مجھے تکلیف دے رہے ہیں"۔ میریؔ نے یہ الفاظ ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے کہے۔

جناب! —— آہ میرے اللہ!! اُسے مجھ سے جُدا ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ہے —— اُس کے ذہن سے باپ کی شکل و شباہت اور آواز محو ہو چکی ہے، اس کے علاوہ مجھے اس ہیئت میں پہچاننا بھی تو بہت دشوار تھا۔ لمبی سی ڈاڑھی۔ یہ ذلیل لباس۔ اُف!! کیا میری تصویر اُس کے ذہن سے اُتر گئی ہے؟

کیا میں اپنی بیٹی کو اسی پیارے اور شیریں لہجے میں ابا کہتے نہ سنوں گا۔ اُف! دماغ پھٹا جاتا ہے۔ دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے —— "جناب!" اُف! یا میرے اللہ!!!

آہ! میں اپنی چالیس سالہ زندگی کے بدلے صرف ایک چیز کا خواہشمند ہوں —— اپنی موت کے عوض صرف ایک کلمہ سننا چاہتا ہوں —— اپنی پیاری بیٹی کے مُنہ سے صرف ابّا کا لفظ!

میں نے اُس کے ننھے اور سپید ہاتھ آپس میں جوڑتے ہوئے کہا "دیکھو میریؔ! کیا تم مجھے جانتی ہو؟"

وہ میری طرف چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "جی نہیں"

"میریؔ، غور سے دیکھو میں کون ہوں"؟

اُس نے بھولے پن سے جواب دیا "ایک صاحب"

آہ! جس ذات سے میری تمام خواہشیں اور مسرتیں وابستہ ہیں، جو میری محبت کا مرکز ہے، میرے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہے مگر مجھے نہیں پہچانتی۔ اپنے تیرہ بخت باپ کی صُورت سے ناآشنا ہے۔

میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "میری بیں تمہارا باپ ہوں"۔

میریؔ نے حیرت سے کہا "ہیں؟"

"کیا میں تمہیں پسند نہیں؟"

"نہیں جناب، میرے ابا تو بہت خوبصورت ہیں"۔

میں نے اُس کے چہرے کو اپنے آنسوؤں اور لگاتار بوسوں سے تر کر دیا۔ وہ گھبرائی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ تو میرے گال اپنی ڈاڑھی سے چھیل رہے ہیں"۔

میں نے اُسے اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا اور کہا "میری کیا تم پڑھ سکتی ہو؟"

"میں پڑھ سکتی ہوں۔ اُمی مجھے روز پڑھایا کرتی ہیں"۔

اچھا تو یہ پڑھو"۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے ایک چھپا ہوا کاغذ لیتے ہوئے کہا جس سے وہ غالباً کھیل رہی تھی۔

اُس نے کاغذ کو کھولا اور ننھی سی اُنگلی رکھتے ہوئے لفظوں کے ہجے کرنے لگی۔ ف، ت، فت، و، ی، دی۔ م، و، مو، ت، موت۔ فتویٰ موت۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ وہ میری سزائے موت کا فتویٰ پڑھ رہی تھی جو بازار میں ایک پیسے کو بک رہا تھا ——— اُس نے یہ غالباً اپنی ماں سے لیا ہوگا۔

اس وقت میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

میری چلّا کر بولی "مجھے میرا کاغذ دے دو"۔

"خدا کے لئے لے جاؤ اسے" یہ کہہ کر میں کرسی پر گر پڑا۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں جبکہ میرے ربطِ دل کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا ہے میں موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار ہوں"۔

باقی تمام کتاب اسی طرح کے درد انگیز و مؤثر مناظر سے بھری پڑی ہے۔

یہ کتاب لکھتے وقت اُس کے پیشِ نظر کتابِ قانون کا سیاہ ترین ورق تھا جس میں متفقہ طور پر موت کی سزا کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہیوگو "سزائے موت" کو عدل و انصاف کے رُو سے غداری سمجھتا ہے اور تنسیخ سزائے موت کے جواز میں بہت سے قاطع دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تنسیخ سزائے موت کے معاشری و مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ معاشرہ کو کسی شخص کو اُس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جو وہ عطا نہیں کر سکتی۔

جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو اُس کے سرورق پر مصنف کے نام کی جگہ ذیل کی چند سطور درج تھیں:۔

"اس کتاب کی تکمیل دو اسباب کی مرہونِ منت ہو سکتی ہے۔ اولاً تباہ شدہ انسان کے احساسات مشاہدات و مدرکات بوسیدہ کاغذات کی صورت میں دستیاب ہوئے ہوں، جو لفظ بہ لفظ نقل کر دیئے گئے ہوں۔ ثانیاً کسی حساس مفکر، شاعر یا فلسفی کے خیالات کا مجموعہ جن کے عمیق سمندر میں وہ برسوں غوطہ زن رہا ہو اور اس وقت تک چین نہ لیا ہو جب تک اُس کے افکار نے کتابی صورت اختیار نہ کر لی۔ ان دو اسباب میں سے کسی ایک سے مصنف کے ذہنی رشتے کی استواری کا انحصار قارئین پر ہے"۔

کتاب کی پہلی اشاعت میں وکٹر ہیوگو نے جبئے فکر کو آزادانہ بہنے سے عمداً باز رکھا شاید اس لئے کہ وہ تفہیم نظریہ کا منتظر تھا۔ دوسری اشاعت میں اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ سرگزشت اسیر کا مقصدِ وحید سزائے موت کی تنسیخ ہے مصنف کے پیشِ نظر کسی خاص مجرم کا تحفظ نہیں اور وہ تمام مجرموں کی طرف سے وکالت کرتا ہے خواہ وہ عہدِ حاضر کے ہوں یا ازمنۂ مستقبل کے۔

ہیوگو انسانی حقوق کا یہ مقدمہ سب سے بڑی عدالت یعنی سوسائٹی میں پیش کرتا ہے اس لئے کہ اُس کے خیال میں سزائے موت کے المناک تاثرات عدالت کی فصاحت میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ "زندگی اور موت کے سوال" کو جو ایک واضح اور عیاں مسئلہ ہے اُس کے حقیقی قیام گاہ پر روزِ روشن میں دکھانا چاہتا ہے۔

انہیں تاثرات کی تخلیق کے لئے اُس نے یہ کتاب لکھی تاکہ اُس کے تاثرات سے متاثر ہو کر سوسائٹی مصنف کے نظریے کو شرفِ قبولیت بخشے۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ اُس کے نظریے کی طرح اس کی کتاب زمان و مکان، امصار و افراد کی تخصیص سے آزاد ہو مصنف نے "سرگزشتِ اسیر" میں کسی خاص فرد، خاص مقام، خاص جُرم، خاص عدالت اور خاص جلّاد کا ذکر نہیں کیا۔ اُس نے جانفشانی کے ساتھ اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر حسّاس قلب اُس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

اُس کے پیشِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سزائے موت کا وجود دُنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے اور اُس کی خواہش ہے کہ اقوامِ عالم کے روشن دماغ معلم اُس کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس شجر کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے جسے انقلاب کی تُند موجیں بھی تباہ نہیں کر سکتیں۔ ہیوگو لکھتا ہے:۔

"اگرچہ کلیدِ انقلاب قفلِ زیست کو وا کرتی ہے اور انقلاب اپنے پس و پیش قحط، زلزلے اور بجلیاں لاتا ہے تاہم اس تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہوتا ہے لیکن انقلاب بھی "سزائے موت" کو موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکا۔

اس کتاب میں وہ اپنے ہم وطنوں کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارے پاس سزائے موت کے جواز میں جس قدر بھی دلائل ہیں مجھے اُن سے آگاہ کرو۔ وہ لوگ جو سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہیں دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایسے متنفس کا وجود جس نے معاشری زندگی میں تلخی پیدا کی قابلِ اخراج ہے۔ سب سے بہترین دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں وہ نظریۂ عبرت ہے۔ ہیوگو نظریۂ عبرت کے ابطال میں مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم نظریۂ عبرت کے قائل ہو تو گردشِ ایام کا رُخ ماضی کی طرف پھیر کر ہمیں سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو، حقیقت میں خوفناک بن جاؤ، ہمارے لئے تکالیف و مصائب کے دروازے کھول دو۔ گزشتہ زمانے کی وحشیانہ سزائیں از سرِ نو رائج کردو، ہر راہگذر پر تختۂ دار نصب کردو، بدنی سزا کو عام کردو۔ پیرس کے بازاروں میں دیگر دکانداروں کی طرح ایک دکان جلّاد کی ہو، جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو ــــ فنا کو بادۂ ہر جام کرنے اور سزائے

موت کو اس طرح عام کرنے سے تم نظریۂ عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکو گے"۔

ہیوگو تنسیخ سزائے موت کے معاشری و مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جس انسان کے لئے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو اس کے معاشری حالات کی حسب ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

اولاً وہ شخص افرادِ خاندان اور صحبتِ احباب سے محروم ہے۔ اس صورت میں وہ صحیح تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکا جب اُس کے دماغ کی اصلاح کے لئے کوئی سعی نہیں کی گئی تو تمہیں اس معاشری[1] یتیم کے قتل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

تم اُسے اس لئے قتل کرتے ہو کہ اُس کا زمانۂ طفلی عدم نگہداشت کی نذر ہوا۔ تم اُسے اپنے کئے کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جُرم کا لباس پہناتے ہو۔

کیا تم اس وقت خوفزدہ نہیں ہوتے جب تم اُس کے بچوں اور بچیوں کا خیال کرتے ہو؟ ——— اُن بچوں کا جن سے زندگی کا سہارا چھن جائے گا۔

کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ آئندہ پندرہ برس تک اس کا بیٹا بھی غالباً زندان میں ہو گا اور بیٹی تعیش پسند امراء کی نفسانی خواہشات کے بجھانے کا ذریعہ ہو گی"۔

وہ غرباء کی لامتناہی و غیر مختتم تکالیف سے متاثر ہو کر لکھتا ہے:۔

"ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غرباء کیلئے اور تمام مسرتیں امراء کے لئے دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں حکومت کو اس فریب دہی میں مدد نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے غرباء کے مصائب میں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل و انصاف کو کام میں لاؤ تاکہ غرباء کو معلوم ہو جائے کہ اُن کے لئے بھی نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی جائے پناہ ہے، ایک ارضی جنت ہے جس کی لطیف فضاؤں سے وہ بھی متمتع ہو سکتے ہیں۔ ان کا مرتبہ بلند کرو تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ امراء کی عشرت پرستی میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں"۔

ہیوگو اخوت اور محبت کی تلاش کرتا ہے چنانچہ وہ اس کتاب کے دیباچے کے آخر میں تحریر کرتا ہے:۔

"میں تمہاری معاونت چاہتا ہوں۔ کس مسئلے میں؟ ——— تبدیلیٔ قوانین میں۔

مسیح کے اخلاقی قانون انسانوں پر پھر حکمران ہوں گے۔ وقت آنے والا ہے جب ہم جُرم کو مرض تصور کرینگے اور ججوں کی جگہ ان امراض کے رفع کرنے والے اور زندانوں کی جگہ شفا خانے ہوں گے۔ ایک نئے افق سے اخوت و محبت کا آفتاب طلوع ہو گا"۔

"سرگزشت[2] اسیر" لکھنے کے بعد ہیوگو نے ایک مختصر افسانہ (Claude Gueux[3]) لکھا۔ اس افسانے کا مقصد بھی تنسیخ سزائے موت تھا۔

سعادت حسن منٹو

---

[1] Social ORPHAN [2] اس افسانے کا راقم الحروف "انتقام اسیر" کے نام سے ترجمہ کر چکا ہے۔ [3] یہ کتاب راقم الحروف کی ترجمہ کردہ ہے۔

وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں

ہیوگو کے اشعار طرزِ ادا کی دل آویزیوں اور موسیقی کی گوناگوں کیفیتوں کا مخزن ہیں ۔ نظم میں قافیہ اور وزن کا التزام اُس پر ختم ہے ۔ الفاظ میں وہ لوچ اور ترنم ہے کہ روح بے اختیار وجد کرنے لگتی ہے ۔ اُس کے اشعار پڑھتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ صفحۂ قرطاس سے اُچھل کر اُس کے دِل میں اُتر گئے ہیں ۔ مگر ہیوگو کی شاعری میں یہی ایک چیز نہیں ۔ اُس کی شاعری اس سے بھی بہت بلند ہے ۔ اُس کے جذبات و افکار میں پاکیزگی ہے ، خلوص ہے ، پائندگی ہے ، رس ہے ، گہرائیاں ہیں ۔ وہ حُسن کو پاک نظروں سے دیکھتا ہے ، محبت اُس کے نزدیک خدا کا قرب ہے ـــــ یہی شاعری کی معراج کمال ہے اور اسی کمال نے اُسے اکنافِ عالم میں مشہور کر دیا ۔ یہاں ہم قارئین کی خدمت میں اس باکمال غنائی شاعر کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اصل زبان کا لطف بڑی حد تک جاتا رہتا ہے مگر راقم نے مقدور بھر اُردو میں اصل کا اچھا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے :-

اگر میرے اشعار کے پَر ہوتے

میرا نازک و شیریں گیت ،
تیرے باغ میں اُڑ کر چلا جاتا ۔
اگر ابابیل کی طرح جو اُڑتی ہے اور گاتی ہے ـــــ
ہاں ابابیل کی طرح میرے راگ کے پَر ہوتے

جب موسمِ گرما دُنیا سے رُخصت ہو جاتا ۔
تو میرے گیت تیرے درخشاں کاشانے کے گرد چکر کاٹتے ۔
اگر میرے ناکام خیالات کی طرح
ہاں تعبیر سے ناآشنا خوابوں کی طرح میرے راگ کے پَر ہوتے

لوری

میں محافظ ہوں تیرا، کسی سے نہ ڈر، پھر سو جا!
فرشتے تیری بند پلکوں پر بوسوں کا مینہ برساتے ہیں۔
میں یہاں موجود ہوں کہ مبادا کوئی بُرا یا درد انگیز خواب تجھے مغموم کر دے

تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیکھ کر طوفان گزر جاتا ہے،
بادل چھٹ جاتے ہیں، ستارے نیلی قبا میں چمکتے ہیں۔
سنجیدہ رات، خوشگوار صبح میں تبدیل ہو جاتی ہے ـــــ
تجھ سے پیار کرنے کے لئے

محبّت

لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے تھے ـــ "محبت کیا ہے؟"
میں انہیں اپنی سمجھ کے مطابق مناسب جواب دے دیا کرتا تھا
مگر یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب میں خود محبت کے حقیقی معنوں سے بےخبر تھا۔
میرا دل برف کے مانند سرد تھا۔
اُس میں محبت کی ایک شعاع بھی نہ تھی
تجربات نے میرے پہلے خیال کو غلط ثابت کر دیا۔
آج میں خود لوگوں سے پوچھتا ہوں ـــــ "محبت کیا چیز ہے؟"

میں ایک ایک سے دریافت کرتا ہوں ـــــ
"میرے سینے میں یہ آگ کیوں سُلگ رہی ہے؟"

یہ کیسا ہاتھ ہے جس کی نازک انگلیاں میرے کلیجے کو ہر وقت مسلتی رہتی ہیں ؛
میں اندر ہی اندر کیوں پھنکا جا رہا ہوں ؛
میرا دل شمع کی طرح کیوں پگھل رہا ہے ؟

میں جنوں کی حالت میں دریا کے کنارے چلا گیا ——— کہ شاید
اُس کی رقصاں لہروں کا نظارہ میرے قلبِ مضطرب کو تسکین دے سکے۔
ایک گوشہ میں بیٹھا میں بڑبڑایا ——— "محبت کیا چیز ہے ؟"
ایک سال خوردہ بزرگ لاٹھی ٹیکتا ہوا اُس طرف سے گزرا ——— اُس کا جسم کمزوری کے باعث لرز رہا تھا
اُس نے میری صدا سُنی اور مسکرا کر کہا۔ "محبت ایک فطری کمزوری ہے جو ہمیں اپنے ابو الآبا سے ورثے میں ملی ہے"۔

وہ چلا گیا ——— مگر اُس کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ میں نے پھر بہ آوازِ بلند کہا۔ "محبت کیا چیز ہے ؟"
ایک بوڑھی عورت کا ادھر سے گزر ہوا ——— اُس نے میری دردانگیز صدا سُنی
اس نے نمناک آنکھوں سے کہا
محبت عہدِ شباب کا وہ شیریں خواب ہے جو منت کشِ تعبیر نہیں ——— خواب جس کی لذت
تمام عمر لوحِ دل سے محو نہیں ہوتی۔

یہ جواب بھی مجھے مطمئن نہ کر سکا۔
پھر وہی صدا میرے دل سے نکلی ———
"محبت کیا چیز ہے ؟"
جواب میں ایک خوبصورت نوجوان یہ گاتا ہوا گزر گیا۔
"محبت قوت ہے، مسرت ہے، لذت ہے"

میں اپنے آوارہ خیالات کو یکجا کرنے نہ پایا تھا ——— کہ ایک فلسفی میرے قریب آیا۔

وہ بغل میں ایک بھاری بھرکم کتاب دابے ہوئے تھا۔
بال بکھر رہے تھے —— اُس نے میری طرف غور سے دیکھا
میں نے اُس سے دریافت کیا —— "محبت کیا چیز ہے"؟
اُس نے اپنی پیشانی کو شکن آلود کرتے ہوئے کہا
"محبت —— محبت مَوت کی طرح انسانی قالب کی ماہیت تبدیل کر دینے والی چیز ہے"۔

اسی اثنا میں علمِ ہیئت کے ایک ماہر کا ادھر سے گزر ہوُا۔
ہاتھ میں دُوربین تھی اور نگاہیں آسمان پر جم رہی تھیں —— میں نے پوچھا
"تمہارا ذہن آسمان تک کی خبر لاتا ہے، کیا تم یہ بتا سکتے ہو، محبت کیا چیز ہے"؟
بولا "محبت وہ کشش ہے جس کی وجہ سے ستارے آسمان پر اپنی اپنی جگہ قائم ہیں"۔

اس جواب سے بھی میں مطمئن نہ ہوُا —— میں پھر اپنے خیال میں ڈوب گیا۔
اب پھر وہی سوال وردِ زبان تھا —— "محبت کیا چیز ہے"؟
میری صدا ایک بچے نے سُنی جو اپنی گیند اُچھالتا دوڑتا چلا آرہا تھا۔
اُس نے جواب دیا "محبت میری امّی ہیں —— محبت میرے ابّا ہیں —— ان دونوں کے سوا اور کسی کے پاس محبت نہیں"؟
اس خورد سال بچے کا جواب پُرمعنی ضرور تھا مگر محبت کے حقیقی معنی پھر بھی میری سمجھ میں نہ آئے۔
میں بار بار یہی پُکارتا رہا —— "محبت کیا چیز ہے؟ —— محبت کیا چیز ہے"؟

شام کی تاریکی کاجل کی طرح برسنے لگی —— پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے گئے۔
دریا کا پانی ساکن ہو گیا —— لوگوں کی آمدورفت بند ہو گئی۔
لیکن میں بدستور وہیں بیٹھا اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا ——
"محبت کیا چیز ہے؟ —— محبت کیا چیز ہے"؟

یکایک میری نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھیں ــــــ بادلوں میں سے کوئی جھانک کر کہہ رہا تھا۔
"محبت خدا ہے ــــــ خدا محبت ہے!"

میرے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ــــــ میں بیہوش ہو کر گر پڑا
ہوش میں آنے پر میں نے لوگوں کو اپنے گرد گھیرا ڈالے ہوئے پایا ــــــ
میں اُن سے کہہ رہا تھا
"محبت کرو اور خدا ہو جاؤ"

نقاب کشائی

اے موہوم سایو، تمہارے قاتل کون ہیں؟ ــــــ بولو!
کس نے تمہارے سینے میں یہ مہلک خنجر گھونپ دیا ہے؟
اے زمانہ کی سربلند ہستیو، اپنی مہرِ خاموشی توڑو،
اپنی تاریکی سے نکل کر حقیقت کی نقاب کشائی کرو!

تمہارا نام ــــــ؟
"مذہب"
اور تمہارا قاتل ــــــ؟

"پادری"
تم تینوں، تمہارے نام؟
"سچائی، نیکی، ایمان ــــــ"
تمہیں کس نے گرا کر موت کے حوالے کیا؟
"کلیسا نے"
اور تم اندھیرے میں کون ہو؟

"مجھے حقوق عوام" کے نام سے پکارتے ہیں"
اچھا بتاؤ تم کس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے؟
"حلفِ وفاداری کے ہاتھوں"
اور تم جو خون میں غرق ہو؟
"میرا نام "عدل" تھا"
تمہیں کس نے ہلاک کیا؟
"منفعت نے"

عوام کا تحمّل

کتنی بار لوگوں نے کہا ہے ——— "طاقت کیا ہے؟"
جو آج راج کرتا ہے کیا وہ کل تخت سے نہیں اُتر جائے گا؟
ہر گھڑی عوام کے لئے نئی مصیبت کا پیغام لاتی ہے ——— مگر
وہ ایک عالی مزاج کی طرح ——— ظالم مگر عادل انجام کا انتظار کرتے ہیں۔
واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھتے ہیں
اعتمادِ نفس نے انہیں قوتِ برداشت دے دی ہے۔
انتہائی طاقت رکھنے کے باوجود ہاتھ نہیں اُٹھاتے ———
اپنی عطا کردہ طاقت سے مسلح ——— "فرد واحد" کو "قوم" کے خلاف بے سود کوشاں دیکھ کر ——— وہ اُسے طاقت آزمائی کے لئے ڈھیل دے دیتے ہیں۔

سعادت حسن

اپنی محبوبہ کے مرنے پر

اے بے رحم و سفاک مَوت!
میری محبوبہ کی زندگی نے تجھے کیا دُکھ پہنچایا تھا
جو تُو نے اسے مجھ سے چھین لیا،

اے سنگین و بدخُو مَوت!
تیرا انتقام اُس وقت تک پُورا نہ ہوگا
جب تک کہ تُو میری زندگی کا بھی خاتمہ نہ کرلے

میری محبوبہ،
آہ میری محبوبہ اور میں،

ہم دونوں ایک تھے،
ایک رُوح تھی
اور دو زندگیاں،

وہ اب مرچکی ہے
میں زندہ ہوں
مگر بے جان
اُسی رنگین پتھر کی طرح
جو قبرستان کی دیوار میں لگا ہو!!

(فرینکوئے وِلاں)

ترجمہ عظیم قریشی

جارج سیں کی تصویر

(گسٹاؤ فلابرٹ کی طرف سے جارج سیں کے نام ایک خط)

کراؤسے
ہفتہ کی شام ۱۸۶۶ء

تمہاری تصویر، آہ دُنیا کی ایک حسین ترین اور جلیل القدر ادیبہ کی تصویر مجھے مِل گئی!! میرے اللہ! کتنا محبوب دلکش چہرہ ہے اور کس قدر سادہ و معصوم!! میں اس کا قد آدم فریم بنوا کر اپنی پہلی ہی فرصت میں اِسے اپنی مطالعہ گاہ کی دیوار پر آویزاں کردونگا!!

ایک دوست نے ایسے ہی ایک موقع پر اپنے ایک دوست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا "یہ دُنیا کی سب سے بڑی عزت ہے جو میرے گھر کو آج نصیب ہوئی ہے!!" اسی فقرے کو دُہرا کر اگر میں تمہارا شکریہ ادا کروں، تو وہ یقیناً تمہاری شان کے شایاں نہ ہوگا، کیونکہ تم میری نظروں میں ایک دوست کے رُتبے سے کہیں بالاتر ہو!!

اِن دونوں میں سے مجھے کاوچ والی تصویر زیادہ پسند آئی، مارشل نے تو تم میں صرف "شرافتِ نسوانی کی جھلک" دیکھی ہے!! مگر میں (جو ایک خرانٹ حسن پرست ہوں) دوسری کے اندر "ایک طبّاع مصنّفہ کا دماغ" پاتا ہوں جس کے رنگین تصوّرات سے میری جوانی ایک طویل عرصے تک لطف اندوز ہوتی رہی ہے!!

ترجمہ عظیم قریشی

ایک گیت

ہم آج ارضِ محبت میں ہیں ؛
کہاں چلیں ؛
چلیں یا یہیں ٹھہرے رہیں ـــــ
اور یا کشتی کھینا شروع کردیں ، پیاری!

ہمارے ملاح عشق پیشہ نوجوان ہیں ،
ہمارے بادبان فاختاؤں کی چونچیں ،
ہمارے تختۂ جہاز زرِ خالص ،
ہماری رسیاں جواں مرگ دوشیزہ کے بال ،
ہم آج ارضِ محبت میں ہیں ،

ہم تمہیں کہاں لے چلیں ، شیریں ؛
اجنبیوں کے کھیتوں میں ؛
اپنے وطن کے مرغزاروں میں ؛
یا جہاں آتشیں پھول کھلتے ہیں ،
یا سپید کلیاں لہلہاتی ہیں ؛
ہم آج ارضِ محبت میں ہیں !

مترجمہ سعادت حسن ـــــ گوئٹے

بودلیئر کی ایک نظمِ منثور

بودلیئر کو نثر میں بھی تقریباً ویسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی نظم میں ۔ اس کی کتاب "چھوٹی چھوٹی منثور نظمیں" بھی اس کے اشعار کی طرح بہت مقبول ہوئی ۔ بودلیئر کو سیاہ رنگ اور دھندلکے سے (غالباً پُر اسرار ہونے کے باعث) خاص دلچسپی تھی ۔ اس کے برعکس مشہور فرانسیسی افسانہ نگار اور شاعر گوتیئے کو سفید رنگ پسند تھا ۔ چنانچہ اس نے ایک عورت کے حسن کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جس میں اس نے عورت کی ایک سفید اور روشن تصویر پیش کی تھی ۔ اس نظم کو ہم "سفید راگ" کہہ سکتے ہیں لیکن بودلیئر نے ایک دوسری عورت کی تعریف میں ایک نظم لکھی جو اسی مناسبت سے "سیاہ راگ" کہلا سکتی ہے ۔ اس نظم کا عاجلانہ ترجمہ جو ظاہر ہے کہ اصل کی طرح دلکش نہیں ہو سکتا ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

وہ سیاہ لباس میں ملبوس رات اور تاریکی کی ایک دیوی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی آنکھیں دو ایسے پاتال توڑ غار ہیں جن میں اَن بُوجھے اسرار جھلملا رہے ہوں لیکن ان آنکھوں کی ایک ہی غلط انداز نگاہ تلملاتے ہوئے کوندے کی طرح رات کے تاریک سینے کو پھاڑ کر نُور کا ایک طُوفان برپا کر سکتی ہے ۔

وہ آبنوس کا ایک سُورج ہے ، ایک کالا ستارہ ! لیکن اس کے گرد و پیش نور و مسرت کی شعاعیں رقص کر رہی ہیں ۔ نہیں ! بلکہ وہ ایک چاند ہے ۔ شاعروں کے پیلے پیلے چاند کی طرح ایک ٹھٹھرتی ہوئی شرمیلی دُلہن نہیں بلکہ وہ تُند چکر کھاتا اور رقص کرتا ہُوا چاند جو ایک

ڈراؤنی، کالی، طوفانی رات میں گھنگھور گھٹاؤں سے دست و گریباں ہو رہا ہو۔

ہاں! وہ نقرئی ستارہ نہیں جو میٹھی نیند سونے والوں کے سنہرے خوابوں پر جلوہ افشاں رہتا ہے۔ بلکہ ایک سیاہ تاب جھلائی ہوئی دیوی جسے آسمانی جادوگروں کے منتر نے نامعلوم مدتوں سے ڈرتی ہوئی زمین کے لرزتے اور کپکپاتے ہوئے سینے پر ایک جناتی ناچ ناچنے کے لئے مجبور کر رکھا ہو۔

اُس کے چھوٹے سے سر میں شکار کی خواہش کا ایک آہنیں عزم کروٹیں لے رہا ہے لیکن اِس کے باوجود اُس کے چہرے کا حسن روح پر ایک نورانی بادل بن کر چھائے جاتا ہے۔ اُس کے ترشے ہوئے نتھنوں کی سانس کوئی منتر پھونکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس کے سُرخ و سفید اور پیارے پیارے شیریں ہونٹوں میں ایک ایسی رنگین تابناکی جھلکیاں دکھا رہی ہے۔ جس کی مثال اُس معصوم پھول سے دی جا سکتی ہے جو کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھل رہا ہو۔

حامد علی خاں

دہلی سے ایک انقلابی اور معیاری مصور ماہ نامے کا اجرا

"کارِخ بلند"

سالانہ چندہ عـ۱۰/ سالانہ چندہ عـ۱۰/

سائز کلاں $\frac{22\times18}{8}$ کتابت وطباعت روشن صفحات ۱۰۸ ۔ ٹائیٹل دو رنگی ۔ کاغذ قسم اعلےٰ ۔ تصاویر آٹھ صفحوں پر آرٹ پیپر

زیرادارت شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی

مدتِ دراز سے میری تمنا تھی کہ ہندوستانی علم وادب اور ہندوستانی ذہن وفکر کو عصرِ حاضر کی سطح تک بلند کرنے کی خاطر ایک ایسا ماہنامہ جاری کروں جو اپنے تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے لحاظ سے زندہ اقوام کے جدید ترین معیارِ صحافت پر پورا اُتر سکے۔

اس وقت حقیقی معیارِ ادب، اُستوارِ آزادیٔ فکر، اور صحیح انتقاد کے نقطۂ نظر سے ہمارا علمی افلاس اس درجہ شرمناک ہے کہ ہم دوسری قوموں کو مُنہ نہیں دکھا سکتے۔

جب تک جمود وجہل کا یہ عالم رہے گا، اور جس وقت تک مُلک کے ادبیات میں ایک ناقابل مقابلہ عظیم انقلاب نہ پیدا کر دیا جائے گا، کسی ذہنی برتری، سیاسی بیداری، اور مادی ترقی کا تصور تک محال ہے۔

اِس لئے اب جب کہ حیدرآباد سے پنشن ہوجانے کے باعث میرے پاس کافی وقت ہے، اور مفکرین کی ایک جماعت بھی میرا ہات بٹانے پر آمادہ ہے، میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ باقی زندگی اسی جدوجہد میں گزار دوں گا۔

لیکن ظاہر ہے کوئی کام سرمائے کے بغیر نہیں چل سکتا، اور میرے واسطے یہ بھی ناممکن ہے کہ میں سرمائے کی خاطر اہلِ دولت کی آستاں بوسی کرتا پھروں، اس لئے اب صرف یہی ایک صورت نظر آتی ہے کہ اگر اپنی قوم سے مجھے اجرائے رسالہ کی خاطر سردست ایک ہزار خریدار مل جائیں جو اپنا پیشگی چندہ منی آرڈر کر دیں تو میں جلد تر رسالہ جاری کر دوں۔

میں دو ماہ تک انتظار کروں گا کہ میرے برادرانِ وطن میری اس مخلصانہ تجویز کا کیونکر خیر مقدم کرتے ہیں۔

میں نے اب تک جس خلوص و بے لوثی سے مُلک کی خدمت کی ہے، اُس سے مجھے توقع ہے کہ میری قوم مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اپنی خدمت کا موقع ضرور دے گی۔

آخر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی قوم سے یہ میری پہلی اپیل کسی نوع کے تاجرانہ تخیل سے آلودہ نہیں ہے۔

میری ذاتی معاش کے واسطے میری تصانیف، میری پنشن اور میری آبائی جائداد کافی ہے۔

سردست میں دھولپور میں ہوں اور میرا پتہ صرف "دھولپور" (راجپوتانہ) کافی ہے۔

"جوشؔ" ملیح آبادی

تار کا پتہ "شفا" دہلی

ٹیلیفون ۵۶۶

پتہ درست کر لیجئے

جب آپ یا آپ کے عزیز بیمار ہوتے ہیں تب آپ کو حکیم اجمل خاں صاحب کے دواخانہ کی تلاش ہوتی ہے، دھوکہ باز عطار اپنی فہرستوں اور اشتہاروں میں ان کا نام بڑی خوبصورتی سے طرح طرح استعمال کرتے ہیں تا کہ وہ آپ کو دھوکہ دے سکیں۔ آپ دھوکا کھا جاتے ہیں اور آپ کے پاس دھوکا باز عطاروں کے کارخانوں سے غلط دوائیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور جب آپ کو ان سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے تو آپ حکیم اجمل خاں صاحب کے دواخانہ کو بدنام کرتے ہیں، اسلئے آپ پتہ نوٹ کر لیجئے اور یاد رکھئے کہ حکیم صاحب مرحوم نے اپنے نام سے کوئی دواخانہ اپنی زندگی میں نہیں کھولا بلکہ جو دواخانہ عطائی اور جاہل عطاروں کے دھوکہ سے بچانے کیلئے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا، اس کا نام

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

رکھا جس کی کل آمدنی سالانہ دو لاکھ روپیہ کے قریب ہے اور جس میں ڈیڑھ سو آدمی فرمائشات کی تعمیل کرتے ہیں اور جس کا کل نفع آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج دہلی پر صرف ہوتا ہے۔

طبیہ کالج کا خرچ تقریباً دس ہزار روپیہ ماہوار ہے جو ہندوستانی دواخانہ برداشت کرتا ہے۔ گویا

ہم آپ سے ایک ہاتھ سے لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے آپ پر صرف کر دیتے ہیں

حکیم صاحب کا مشن صحیح دوا بہم پہنچانا اور تندرست جسم پیدا کرنا تھا، زندگی میں انہوں نے اس مقصد کو پورا کیا اور اب ان کے جانشین ہندوستانی دواخانہ کے سرپرست عالی جناب حکیم محمد احمد خاں صاحب بالقابہ تنہا ان کے مشن کو پورا کر رہے ہیں۔

نوٹ (۱) باہر سے جو مریض اپنے حالات مرض لکھکر روانہ کرتے ہیں ان کو حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور حکیم صاحب کے مشورہ کے بعد حسب فرمائش دوائیں روانہ کر دی جاتی ہیں یا اُن کو مجوزہ دوا سے مطلع کر دیا جاتا ہے۔

(۲) پانچ سیر تک کا پارسل بذریعہ ڈاک روانہ ہو سکتا ہے۔ پانچ سیر سے زیادہ وزن کا پارسل بذریعہ سواری گاڑی روانہ ہوگا لیکن اس کیلئے نصف قم پیشگی آنا ضروری ہے۔

(۳) کارخانہ میں ہر زبان کی فہرستیں تیار رہتی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگالی میں سے جس زبان کی فہرست مطلوب ہو مفت طلب کیجئے۔

(۴) پتہ صاف اور خوشخط لکھیئے۔

چند مفید دوائیں

مصفی خون کی ہر قسم کی خرابی کو دور کرنے میں اکسیر ہے۔ گرمی دانے، مہاسے، چھائیں، پھوڑے پھنسیاں، داد، چھاجن، برص، سوزاک، آتشک سب میں یکساں مفید ہے، جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اسلئے حفظ ماتقدم کیلئے حالت تندرستی میں بھی استعمال کر سکتے اور بچوں کو بھی دے سکتے ہیں۔ ترکیب استعمال۔ ایک ایک خوراک تھوڑے پانی میں ملا کر صبح دوپہر اور شام پی جاتی ہے۔ قیمت ۲۶ خوراک ڈیڑھ روپیہ (محصولڈاک علاوہ)

اکسیر نسواں رحم سے رطوبت آنے (لیکوریا) اور حیض کی بے قاعدگی میں نہایت مفید ہے حمل نہ ٹھہرنا یا بار بار ساقط ہو جانا حیض کا درد سے آنا، کمر اور پنڈلیوں کا درد، رحم کا ضعف اور ورم، ان سب شکایتوں میں حیرت انگیز نفع پہنچاتی ہے۔ ہسٹیریا میں بھی مفید ہے۔ حاملہ کیلئے اس کا استعمال ممنوع ہے۔
قیمت فی شیشی بارہ آنہ (۱۲) محصولڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول
سالانہ چندہ للعہ
بہار نمبر ۸؏
رسالہ "ندیم" گیا
بہار نمبر
بلند پایہ مقالوں، معیاری فسانوں، اعلیٰ ڈراموں، وجد آفریں نظموں، پرکیف غزلوں، دلچسپ مزاحیہ مضامین اور آرٹ کی رنگین تصاویر کا حامل ہوگا۔
بہار نمبر
کی نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ اسکے لکھنے والے سب کے سب بہاری حضرات ہوں گے۔ اور اس کی تصویریں بھی بہاری آرٹسٹوں کی شاہکار ہونگی۔
کا
دوسرا
بہار نمبر ۱۹۳۵ء
ستمبر ۱۹۳۵ء میں نہایت ہی آب و تاب سے
شائع ہو جائے گا
بہار نمبر
میں آرٹ کی تصویروں کے علاوہ صوبہ کے مشہور ادبا اور شعراء نیز دلچسپ مناظر و مقامات کی تصویریں ہونگی۔
بہار نمبر
بہار کے ادب اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہوگا
قیمت صرف ۸؏ (علاوہ محصول ڈاک)
مستقل خریداروں کو مفت
انتظار کیجیے
ستمبر ۱۹۳۵ء
میں شائع ہوگا
مشتہرین کیلئے خاص رعایت رکھی گئی ہے
N. Ahmad
Rajhati

بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوائی
ڈونگرے کا بال امرت
یہ
ڈونگرے کا بال امرت
میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں۔
چھوٹے بچوں کی کھانسی، بخار، بدہضمی، ہیچش وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی
کی وجہ سے ہوتے ہیں اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں۔ اور
اس سے بچوں کا بدن تھوڑے ہی عرصہ میں گوشت سے بھر کر
جسم میں طاقت بڑھتی ہے
لاہور ایجنٹ
بھگت رام پوری اینڈ سنز، سوتر منڈی لاہور
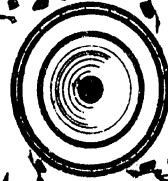
سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔